بسمہ تعالیٰ

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

پہلا سبق

دین کی ضرورت کیوں؟

بیچلر B.A

تمہید

دین مقدس اسلام، عقائد، احکام اور اخلاق، تین چیزوں کا مجموعہ ہے. اور ان تین چیزوں میں سے عقائد نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں. کیونکہ جس وقت تک انسان کا عقیدہ درست نہیں ہوتا، اس وقت تک دین کے احکام پر صحیح معنوں میں انسان عمل پیرا نہیں ہو سکتا. اور نہ ہی اسے اخلاق حسنہ یعنی پسندیدہ اخلاق کی پہچان ہو سکتی ہے.
لہٰذا ہم اس سلسلہ مباحث میں دینی عقائد یعنی توحید، عدل، نبوت اور امامت کے بارے میں مختصر اور مدلل بحث کریں گے.

تفصیل

عقائد کی اصلی مباحث شروع کرنے سے پہلے ہم تمہید کے طور پر کچھ مطالب بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں.
ان اہم مطالب میں سے ایک بات یہ ہے کہ کیا دین کے بارے میں تحقیق ضروری ہے؟ اور اگر ضروری ہے تو اسکے اسباب اور عوامل کیا ہیں؟
اس سلسلے میں عرض ہے کہ انسان کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ مختلف چیزوں کی حقیقت کو درک کرنا چاہتا ہے. اور جب تک اسے اپنی مورد نظر چیز کی واقعیت اور حقیقت کا پتہ نہ چل جائے، وہ سکون سے نہیں بیٹھتا.
لہٰذا اس سبق میں ہم ان امور کی طرف اشارہ کریں گے جو انسان کو جستجو اور تحقیق پر مجبور کرتے ہیں. جنھیں ہم تحقیق کے عوامل سے تعبیر کریں گے.

پہلا عامل

فطرت: فطری طور پر حضرت انسان کے اندر تحقیق اور جستجو کا مادہ پایا جاتا ہے یعنی انسان کے اندر کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کرنے اور جاننے کی حس پائی جاتی ہے، جو اسے دین کے مختلف مسائل کے بارے میں بھی جستجو اور تحقیق کرنے پر مجبور کرتی ہے. وہ امور جن کے بارے میں انسان کی حس جستجو زیادہ رہتی ہے ان میں چند ایک انتہائی اہم ہیں.

۱ .کیا غیب کا وجود ہے یا نہیں ؟
۲ .آیا اس مادی جہان اور جہان غیب کے درمیان کوئی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں ؟
۳ .کیا اس مادی جہان کا کوئی خالق ہے یا نہیں ؟
۴ .اس مادی جہان کا خالق کن خصوصیات کا حامل ہے.؟
۵ .کیا وہ خالق قابل رؤیت ہے یا نہیں؟
اس قسم کے مختلف سوالات ،انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں. جسکا عامل اور محرک فطرت انسان ہے.
پس پہلا عامل فطرت انسان ہے جو اسے تحقیق پر آمادہ اور تیار کرتا ہے.

دوسرا عامل

آرزوؤں کا حصول؛ حضرت انسان اپنی آرزوؤں کے حصول کے لئے دن رات کوشش کرکے ان تمام اسباب کو مہیا کرتا ہے جو اس راہ میں اس کے لئے معاون ثابت ہوں. مثال کے طور پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ سائنس اور جدید علوم دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لئے اس کے مددگار ہیں. لہٰذا ان علوم کے حصول کے لئے دن رات کوشش کرتا ہے.
اسی طرح اگر انسان کے لئے واضح ہو جائے کہ دین بھی اس کی اس سلسلے میں مدد کرتا ہے اور اس پر دینی مسائل کی اہمیت واضح کر دی جائے کہ دین، ادب سکھاتا ہے، اخلاق سکھاتا ہے، دینی احکام کے سائے میں ایک پر امن اور متعالی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جس سے اس کے مفادات کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اسے تحفظ مل جاتا ہے. تو وہ ضرور بالضرور دین کے بارے میں تحقیق کرے گا.
پس اس نظریے کے مطابق فطرت اور انسان کی مادی ضروریات اس کو دین کے بارے میں تحقیق پر مجبور کرتی ہیں.
اس نظریے کی تائید کے لئے قرآن اور ائمہ معصومین کے فرمودات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے.
اس کے مقابلے میں بعض انسانوں نے یہ دعوی کیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے لوگوں کو سعادت و ہدایت تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور ان لوگوں نے حیات جاودانی اور نعمت و سعادت کی بشارت بھی دی ہے تو اس بات کی جانچ پڑتال کے لئے دین میں تحقیق و جستجو کی ایک عجیب سی امنگ پیدا ہوتی ہے. کیونکہ انسان جب ایسی بات کسی سے سنتا ہے تو پھر اس کی حقیقت اور تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے.

یہاں پر ایک تیسری بات بھی کی جاتی ہے کہ کیا تنہا اس صورت میں تحقیق و جستجو مفید ہے کہ جب اس کے حل کی امید ہو اور جس چیز میں زیادہ سے زیادہ نتیجہ بر آمد ہونے کی توقع ہو انسان اسی کے پیچھے جاتا ہے.
اس کا جواب اس طرح دیا جائے گا کہ:
الف) دین کے اساسی اور بنیادی مسائل کو حل کرنا کسی بھی صورت میں علمی مسائل کے حل کرنے سے کم نہیں ہے.
ب) دوسرا یہ کہ آپ کی بات ایک احتمال کی حد تک ہے اور احتمال کی قدر و قیمت تنہا ایک عامل کے تابع (مقدار احتمال) نہیں ہے بلکہ اس کے درمیان محتمل کی مقدار کو بھی جاننا اور سامنے رکھنا ضروری ہے.

خلاصہ

۱. حقیقت جوئی کی فطرت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو دین کے دائرے میں موجودہ مسائل کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اور دین حق کی شناخت کے لئے آمادہ کرتی ہے.
۲. منفعت طلبی کی حس اور نقصان سے بچنے کا رجحان، فطرت اور دین میں اور زیادہ تحقیق و جستجو کی امنگ کو افزائش دینے کا سبب ہے.
۳. دین کے اساسی مسائل کو حل کرنا کسی بھی صورت میں علمی مسائل کے حل کرنے سے کم نہیں ہے.
۴. احتمال کی قدر و قیمت تنہا ایک عامل کے تابع (مقدار احتمال) نہیں ہے بلکہ اس کے درمیان محتمل کی مقدار کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوگا.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

دوسرا سبق

دینی تصور کائنات

بیچلر B.A

تمہید

اس سبق میں ہم دین میں تحقیق کرنے کے لیے حضرت انسان کو دعوت دینے کا مقصد بیان کریں گے . اس کے بعد یہ بتایا جائے گا کہ کمال انسانی سے کیا مراد ہے اور اس کمال کا حصول کیونکر ممکن ہے .
اور آخر میں یہ بتایا جائے گا کہ عقل کے عملی احکامات کو نظریاتی اصولوں کی کیا ضرورت ہے . اور اس کے بعد اسی حوالے سے ایک شبہ اور اس کے حل کے بارے میں بحث کی جائے گی .

تفصیل

دین کے لغوی معنی اطاعت اور جزا کے ہیں اور اصطلاح میں اس جہان، انسان کے پیدا کرنے والے پر عقیدہ رکھنا اور ان عقائد سے متناسب دستورات عملی پر اعتقاد رکھنے کے معنی میں ہے .
حضرت انسان کو دین کے بارے میں تحقیق کی دعوت دینے کا مقصد اسے کمال تک پہنچانا ہے، لیکن دین میں تحقیق کے علاوہ کمال انسانی تک پہنچنے کے لئے انسان کو اس پوری کائنات کے بارے میں صحیح انداز سے غور و فکر کرنے کی بھی ضرورت ہے .
یعنی انسان کو صحیح اور درست تصور کائنات اور نظریاتی بنیادوں کی ضرورت ہے . اس سبق میں ہم اسی امر کو چند مقدمات کی صورت میں بیان کریں گے جو مندرجہ ذیل ہیں .
۱ . انسان کمال کو چاہتا ہے .
۲ . انسان کا کمال عقل کی پیروی اور تابعداری میں مضمر ہے .
۳ . عقل کے عملی احکام کو کچھ مبادیات اور بنیادی باتوں کی ضرورت ہے .

۱ . انسان کا کمال طلب ہونا

انسان کے اندرونی جھکاؤ اور رجحانات میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سارے کے سارے ایک ہی ہدف کی طرف گامزن ہیں . اور وہ ہدف انسان کو کمال تک پہنچاتا ہے، اسی غرض سے انسان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسکے عیب کسی پر ظاہر نہ ہوں اور کمالات سب پر عیاں رہیں تاکہ وہ اپنے ہدف تک پہنچ سکے . اب یہ کمال صرف اور صرف دین کے سائے میں ہی حاصل ہو سکتا ہے .

۲ . کمال انسانی کا عقل کی پیروی میں مضمر ہونا

مادی جہان میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نباتات کا بیرونی اسباب اور شرائط کے تحت رشد و نمو کرنا ایک قہری اور جبری امر ہے. کوئی بھی درخت اپنی مرضی سے رشد نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ ارادہ اور شعور نہیں رکھتا ہے، لیکن نباتات کے مقابلے میں حیوانات ایک حد تک شعور کے حامل ہیں اور وہ اپنے رشد و نمو کے لئے باطنی غرائز کے تحت مناسب ماحول اور شرائط کا انتخاب کرتے ہیں. جس کی وجہ سے وہ رشد پاتے ہیں.
لیکن نباتات اور حیوانات کے مقابلے میں انسان کو اللہ تعالی نے عقل جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے جس کے سائے میں وہ کمال مطلوب حاصل کرتا ہے.

۳ . عقل کے عملی احکام کو نظریاتی اصولوں کی ضرورت

انسان اپنے ارادے اور اختیار کے ذریعے کمال مطلوب کو حاصل کرتا ہے اور عقل، انسان کے اختیاری اعمال پر اس وقت قضاوت کر سکتی ہے جب انسانی کمالات اور انکے مراتب سے پوری طرح آگاہ ہو، اور جانتی ہو کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ اسکی خلقت کا مقصد کیا ہے؟
یہی وجہ ہے کہ جب تک عقل ان مسائل کو حل نہیں کر لیتی اس وقت تک کردار و اعمال کے سلسلے میں کوئی قطعی قضاوت نہیں کر سکتی. لہٰذا یہ نظریاتی تعلیمات جو تصور کائنات کے بنیادی مسائل کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں، حقیقت میں اسے ہی عقل کے عملی احکام اور ایک عظیم نظام کے معنی میں شمار کیا جاتا ہے.

خلاصہ

۱. دین کے لغوی معنی اطاعت اور جزا کے ہیں اور اصطلاح میں اس جہان، انسان کے پیدا کرنے والے پر عقیدہ رکھنا اور ان عقائد سے متناسب دستورات عملی پر اعتقاد رکھنے کے معنی میں ہے.
۲. کسی بھی دین میں اس کے عقائد کو اصول اور احکام عملی کو فروع کا نام دیا جاتا ہے.
۳. انسان کی خلقت کا مقصد کمال تک رسائی حاصل کرنا ہے.
۴. کمال انسانی کا حصول عقل کی پیروی میں مضمر ہے، کیونکہ عقل انسان کے لیے خدا کی باطنی حجت ہے.
۵. انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے کمال تک رسائی حاصل کرتا ہے. لیکن بعض ایسے مسائل ہیں جو عقل انسانی سے بالاتر ہیں اور انہیں درک کرنے کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

تیسرا سبق

معرفت خدا کی اقسام

بیچلر B.A

تمہید

جب ایک انسان معرفت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے اور دین حق کے اصول و قواعد کی پہچان کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان سوالوں کا سامنا کرتا ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل کو حل کرے؟ کس طریقہ سے بنیادی اور صحیح معارف کو حاصل کرے؟ اور بنیادی طور پر ان کی شناخت کے راستے کیا ہیں؟ نیز ان میں سے کسے ان معارف تک پہنچنے کے لئے انتخاب کرے؟

ان مطالب پر فنی اور تفصیلی گفتگو کرنے کے لے فلسفہ کی ایک بحث ا (شیاء کی معرفت) (اپیسٹمولوجی) کا سہارا لینا ضروری ہے، ' کہ جس میں شناخت انسان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ہم یہاں پر ان تمام پہلوؤں سے بحث نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ ہمیں اس کتاب میں اصل ہدف سے دور کردیں گے، اس وجہ سے ان میں سے فقط بعض کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور مزید تحقیق کے لے (انشاء اللہ) ہم ضرورت پڑنے پر اشارہ کریں گے [1] لہٰذا ہم اس سبق میں شناخت انسان کی قسمیں اور ان سے متعلقہ تفصیل بیان کریں گے.

تفصیل

شناخت کی قسمیں

انسان کی اس شناخت کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے.

ا. شناخت علمی (تجربی) (خاص اصطلاح میں) یہ شناخت، حسی امور کی مدد سے حاصل ہوتی ہے اگر چہ عقل ادراکات حسی کی عمومیت اور اس کے مجرد عن المادہ ہونے میں اپنا پورا کردار ادا کرتی ہے شناخت علمی سے، تجربی علوم مثلاً سائنس، لیبارٹری، اور حیاتیات جیسے علوم میں استفادہ کیا جاتا ہے.

[1] اس سلسلہ میں مزید اطلاع حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کے دوسرے حصہ "آموزش فلسفہ" اور مقالہ "شناخت" جو کتاب پاسداری از سنگرھای ایدئولوژیک" میں ہے، اور ایدئولوژی تطبیقی کے دروس میں سے پانچویں درس سے سولہویں درس تک کا مطالعہ کیا جائے

۲. شناخت عقلی : ایسی شناخت مفاہیم انتزاعی (معقولات ثانیہ) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس میں اساسی اور بنیادی رول عقل کا ہوتا ہے، ہر چند اس بات کا امکان ہے کہ بعض قضایا بہ عنوان مفاھیم انتزاعی یا مقدمہ از قیاس ہونے کی وجہ سے حسی و تجربی ہوں، اس شناخت کی وسعت
منطق، علوم فلسفیہ، اور ریاضیات سب کو شامل ہے.
۳. شناخت تعبدی : اس شناخت کی حثیت ثانوی ہے، جو (قابل اعتماد ماخذ و مدرک) (اتھارٹی) اور صادق شخص کے خبر دینے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے وہ مطالب جو پیروان دین، اپنے دینی رہنما ہونے کے ناطے ان کے اقوال کو قبول کرتے ہیں، اور کبھی کبھی ان کا یہ اعتقاد حس و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اعتقاد سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے جو اسی شناخت کا ایک حصہ ہے.
۴. شناخت شہودی : یہ شناخت دوسری اقسام کے بر خلاف مفہوم ذہنی کے واسطہ کے بغیر معلوم ذات عینی سے متعلق ہوتی ہے، جس میں کسی قسم کے اشتباہ کا امکان نہیں رہ جاتا لیکن جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ جو کچھ بھی شہودی اور عرفانی کے نام سے بیان کیا جاتا ہے در حقیقت شہودات کی ایک ذہنی تفسیر ہوتی ہے جو قابل خطا ہے.

معرفت کی قسمیں

شناخت کی قسمیں جن اصولوں کی بنیاد پر بیان کی گئیں ہیں انھیں اصولوں کے ذریعہ جہاں بینی کی بھی تقسیمات کی جاسکتی ہیں.
۱. معرفت علمی : یعنی انسان، علوم تجربی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج کے ذریعہ ہستی کے سلسلہ میں ایک کلی معلومات حاصل کرے.
۲. معرفت فلسفی : وہ معرفت جو از راہ استدلال اور عقلی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہو.
۳. معرفت دینی : وہ معرفت جو رہبران دین پر ایمان رکھنے اور ان کی گفتار کو قبول کرنے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے.

معرفت عرفانی : وہ معرفت جو کشف و شہود اور اشراق کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعا جہان بینی کے بنیادی مسائل کو انھیں چار تقسیموں کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے، تاکہ ان میں کسی ایک کے برتر ہونے کا سوال پیدا نہ ہو.

خلاصہ

۱. شناخت کی چار قسمیں ہیں:

۱. شناخت علمی، جو حسی امور کی مدد سے حاصل ہوتی ہے.
۲. شناخت عقلی، اس میں اساسی اور بنیادی رول عقل کا ہوتا ہے.
۳. شناخت تعبدی، یہ صادق شخص کے خبر دینے کے ذریعے حاصل ہوتی ہے.
۴. شناخت شہودی، مفہوم ذہنی کے واسطہ کے بغیر معلوم ذات عینی سے متعلق ہوتی ہے.

۲. معرفت کی بھی چار قسمیں ہیں:

۱. معرفت علمی، تجربات کے ذریعے کلی معلومات کا حصول
۲. معرفت فلسفی، استدلال اور عقلی کاوشیں
۳. معرفت دینی، رہبران دین کی گفتار کو قبول کرنا
۴. معرفت عرفانی، کشف و شہود اور اشراق

۳. معرفت کے اصولوں کو معرفت علمی کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ یہ مسائل علوم تجربی کی حدود سے خارج ہیں، اسی طرح تعبدی اور عرفانی اسلوب کے ذریعے بھی ان مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا.

۴. پس جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ تنہا وہ راستہ جس نے معرفت انسان کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے والوں کے سامنے راہیں ہموار کی ہیں وہ راہ عقل ہے اور تدبر و تفکر ہے لہٰذا اس جہان بینی واقعی کو جہان بینی فلسفی تسلیم کرنا چاہئے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چوتھا سبق

معرفت خدا

بیچلر B.A

تمہید

دین کی اساس اور بنیاد کائنات کے خلق کرنے والے پر اعتقاد (یقین) رکھنا ہے. معرفت الہی اور معرفت مادی کے درمیان اصلی فرق اسی کا پایا جانا یا نہ پایا جانا ہے. گذشتہ سبق میں معرفت کی چار قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس سلسلے میں بیان کیا ہے کہ عقائد کے باب میں معرفت عقل ہی سب سے معتبر معرفت ہے .اس سبق میں ہم اسی نکتہ کی وضاحت کریں گے اور آخر میں معرفت انسان سے متعلق قرآنی آیات کو بیان کریں گے تاکہ واضح ہو سکے کہ قرآن کریم نے معرفت کو کس انداز سے بیان کیا ہے.

تفصیل

گزشتہ سبق میں معرفت کی چار قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا اور اس سلسلے میں بیان کیا تھا کہ عقائد کے باب میں معرفت عقلی ہی سب سے بہتر اور معتبر قسم کی معرفت ہے. جس کے ذریعہ طبیعت اور ماوراء طبیعت تمام چیزوں کو ثابت کیا جاسکتا ہے.

یعنی معرفت عقلی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے ذریعے انسان کمال مطلوب کو حاصل کر سکتا ہے. البتہ اس کمال مطلوب سے مراد خدا اور اس کے اسماء و صفات کی معرفت ہے جو انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کی ضامن ہے. اور انسانی کمالات کا دار و مدار بھی اسی ذات کی معرفت میں پوشیدہ ہے. اب وہ ذات کہ جس کی معرفت انسان کی اصلی غرض اور مقصد ہے، ہر قوم و ملت اس ذات کو ایک خاص نام سے یاد کرتی ہے، مثال کے طور پر عربی میں اسے "اللہ"، انگلش میں اسے "God'' اور فارسی میں "خدا" کہتے ہیں.

اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کون ہے؟ اس کی صفات کیا کیا ہیں؟ اور اس کا ہمارے ساتھ رابطہ کیسا ہے؟ ہم کس طرح اس کے ساتھ رابطہ برقرار کر سکتے ہیں.

اس مقدس ذات کا مختلف افراد نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تعارف کروایا ہے، جسے مختلف افراد نے اپنے ذوق کے مطابق بیان کیا ہے.

فلاسفہ یونان اور مغرب نے اپنے ذوق فلسفی کے تحت ذات باری تعالی کو بیان کیا ہے. نیوٹن اور گالیلہ نے اپنے سائنسی ذوق کے تحت ذات باری تعالی کا ذکر کیا ہے. کہ جن کی تفصیل علم کلام کی بڑی کتابوں میں موجود ہے آپ وہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں.

بہر حال کسی نے بھی ذات باری تعالی کی حقیقت کو اس طرح کہ جیسے اس کی شان کے لائق ہے بیان نہیں کیا. بلکہ یہ صرف اور صرف دین مقدس اسلام کا طرہ امتیاز ہے کہ جس نے خدا کی ذات، اسماء اور صفات کو صحیح معنوں میں بیان کیا ہے. اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے. کیونکہ جس طرح قرآن کریم نے ذات باری تعالی کا تعارف کروایا ہے، کسی دوسرے مکتب و مذہب میں اس طرح تعارف نہیں کرایا گیا، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے ادیان الٰہی میں بھی اس انداز سے تعارف نہیں ملتا ہے.

اس مقام پر ہم قرآن مجید میں خدا کی ذات اور صفات کے بارے میں پائی جانے والی آیات میں سے چند ایک آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ہمارے قاری محترم پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا انداز تعارف کیا ہے:

"وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ"[1]

ترجمہ: اور مشرق ہو یا مغرب، دونوں اللہ ہی کے ہیں، پس جدھر بھی رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے، بے شک اللہ (سب چیزوں کا) احاطہ رکھنے والا، بڑا علم والا ہے۔

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ"[2]

ترجمہ: وہی اول اور وہی آخر ہے نیز وہی ظاہر اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔

"اللَّهُ الصَّمَدُ"[3]

ترجمہ: اللہ بے نیاز ہے۔

"وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ"[4]

ترجمہ: اور وہ بڑا معاف کرنے والا، محبت کرنے والا ہے۔

"غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ"[5]

ترجمہ: جو گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، شدید عذاب دینے والا اور بڑے فضل والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

---

[1]. بقرہ/ ۱۱۵

[2]. حدید/۳

[3]. اخلاص/۲

[4]. بروج/۱۴

[5]. غافر/۳

"لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"[1]

ترجمہ : جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے اور تم اپنے دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے حساب لے گا پھر وہ جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

"وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ"[2]

ترجمہ : اور اللہ نے فرمایا: تم دو معبود نہ بنایا کرو، معبود تو بس ایک ہی ہے پس تم صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

"وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا"[3]

ترجمہ : اور زیبا ترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس تم اسے انہی (اسمائے حسنیٰ) سے پکارو.

"وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ"[4].

ترجمہ : اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہی بڑا حکمت والا ، باخبر ہے۔

ان آیات کو ملحوظ خاطر رکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآن مجید حقیقت میں کتاب معرفت خدا ہے. اور اس سلسلے میں آیات الٰہی اتنی عمیق اور دقیق ہیں کہ کوئی بھی دانشور اس کے حقیقی معانی کو درک نہیں کر سکتا. اس سلسلے میں حضرت امام خمینی (سلام اللہ علیہ) لکھتے ہیں: "اگر قرآن مجید نہ ہوتا تو ہمارے اوپر خدا کی معرفت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند رہتا. اور جس طرح قرآن میں خدا کی ذات اور صفات کو بیان کیا گیا ہے کسی کتاب میں اس انداز سے بیان نہیں کیا گیا ہے".[5]

قرآن کریم کا اپنا ایک لطیف اور دلچسپ انداز ہے جو کسی بھی عرفانی کتاب میں نہیں پایا جاتا پس خدا کی معرفت کا درست حصول انہی آیات الٰہی میں دقت کرنے سے ہی ممکن ہوگا.

---

[1]. بقرہ/۲۸۴

[2]. نحل/۵۱

[3]. اعراف/ ۱۸۰

[4]. انعام/۱۸

[5]. درس نامہ عقائد/شیروانی/ص ۷۳

خلاصہ

۱. معرفت عقلی کا دائرہ بہت وسیع ہے.

۲. کمال مطلوب سے مراد خدا اور اس کے اسماء و صفات کی معرفت ہے جو انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کو متضمن ہے.

۳. اس مقدس ذات کا مختلف افراد نے اپنے اپنے ذوق فلسفی کے تحت تعارف کروایا ہے.

۴. یونانی اور مغربی فلاسفہ نے اپنے ذوق فلسفی کے تحت ذات باری تعالی کو بیان کیا ہے.

۵. دین مقدس اسلام کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ جس نے خدا کی ذات اسماء اور صفات کو صحیح معنوں میں بیان کیا ہے.

۶. جس طرح قرآن کریم نے ذات باری تعالی کا تعارف کروایا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ہے.

۷. قرآن مجید کتاب معرفت خدا ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

پانچواں سبق

فطرت

بیچلر B.A

تمہید

قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر انسان فطری طور پر خدا کے وجود کو قبول کرتا ہے، اور اس کے اندر خدا کی عبادت اور پرستش کا جذبہ پایا جاتا ہے. یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اور قوم عاد و ثمود اور ان کے بعد والی قومیں بھی وجود خدا کا اقرار کرتی تھیں. ان کا اختلاف صرف اور صرف اپنے زمانے کے الٰہی نمائندوں کے ساتھ، خدا کی وحدانیت، نبوت اور معاد سے متعلق مسائل میں تھا.
جب انسان فطری طور پر خدا پرست ہے، تو مطلب کی وضاحت کے لئے یہاں پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ فطرت سے کیا مراد ہے کہ جس کی بنا پر انسان خدا پرست ہے اور جب سے انسان ہے اس میں خدا پرستی کا عنصر پایا جاتا ہے.

تفصیل

کامل اور مثالی کائنات کے تصور کی خاصیت یہ کہ وہ انسان کی فطرت و سرشت سے ہم آہنگ ہو اور اس کی بنیاد عقلی استدلال اور برہان پر استوار ہو. خدا پرستوں نے اپنے مدعا پر جو دلیلیں پیش کی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ان میں سے بعض کا تعلق استدلال سے ہے اور بعض انسان کی فطرت سے متعلق ہیں ہم یہاں بعض دلائل کی طرف اشارہ کریں گے.

فطرت کے معانی

فطرت کے لغوی معانی سرشت و طبیعت کے ہیں اور اصطلاح میں ہر انسان کے معنوی جذبہ اور خواہش کو فطرت کہا جاتا ہے.

۱. مادی خواہشات

جو مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انسانی وجود میں پوشیدہ ہوتی ہیں جیسے حب ذات، بھوک، پیاس، خوف، امید وغیرہ.

۲. معنوی خواہشات

جیسے ترقی، دوستی، ایثار و قربانی، احسان و شفقت اور اخلاقی ضمیر، یہ خواہشات انسانی وجود میں اس لئے رکھی گئی ہیں تاکہ وہ حیوانیت کی حدود سے نکل کر واقعی اور حقیقی کمالات تک پہنچ سکے.

انسان کی خداجوئی

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا تصور انسان کے وجود کے ساتھ متصل رہا ہے. خدا شناسی اور اس پر اعتقاد رکھنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فکر بشر کے لئے علم فلسفہ اور استدلال سے گھڑ لی گئی ہو بلکہ یہ فکر انسان کی ابتدائے حیات ہی سے اس کے ساتھ ہے اور طول تاریخ میں آدمی کے دل و دماغ کے لئے اطمینان بخش رہی ہے. اب سوال یہ ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ کیوں خدا کو نہیں مانتا؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر خداجوئی فطری ہے اور ایسا رجحان ہے جو انسان کی جبلت میں رچا بسا ہے تو پھر ایک گروہ اس فطری میلان سے کیوں بے بہرہ ہے اور خدا کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتا؟

ہم کہتے ہیں کہ فطری خداجوئی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تمام انسانوں میں یکساں طور پر منقسم ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے وجود میں مضمر کر دی گئی ہے. انسان اس کو روشن و درخشاں بھی کر سکتا ہے اور اس پر عارض ہونے والی غلاضتوں سے اسے دور بھی رکھ سکتا ہے. انسان کے اندر عدل و انصاف کی طرف رجحان موجود ہے مثلاً عدل کے نفاذ میں اگر کسی شخص کے سامنے اس کے والدین کی محبت آ جاتی ہے یا اس کے بر عکس کوئی شخص اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت رکھتا ہے لیکن اجتماعی نظام کے تحفظ و احترام کے لئے وہ اسے زندہ در گور کرنے کے لئے بھی تیار ہے اور جو امور بنیادی طور پر انسان کی فطرت میں شامل ہیں ممکن ہے سرکشی اور شدت پسندی کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک پہلو کو وہ اس کے لیے تاریک کر دے یا ان پر پردہ ڈال دے لیکن یہ رجحانات کسی وقت بھی انسان کی فطرت سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ جب بھی ان سے گرد و غبار صاف ہو جائے اور پردہ ہٹ جائے یہ روشن و آشکار ہو جائیں گے.

قرآن کی اصطلاح میں فرعون کی بادشاہت نے اسے اس کی فطری آواز پر کان نہیں دھرنے دیئے. جب اس نے خود کو لہروں کے گرداب میں پایا اور یہ دیکھ لیا کہ اس کی پوری بادشاہت و قدرت ان چند بپھری ہوئی موجوں کے مقابلہ میں کمزور اور ناتوان ہے تو چلایا کہ میں موسیٰ (ع) کے خدا کی خدائی کا اعتراف کرتا ہوں اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے.

یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اپنی تبلیغ میں ہر گز خدا پرستی پر زور نہیں دیا ہے کیونکہ انسان فطری طور پر خدا پرست تھے اور ہمیشہ کائنات کے مبداء کے اعتقاد میں زندگی گزار رہے تھے لیکن غیر منطقی راہوں پر چلنے اور شیطانی راستوں کا اتباع کرنے کی وجہ سے فطری راہوں سے ہٹ گئے تھے اور خدا کے بارے میں ان کا اعتقاد شرک سے آلودہ ہو گیا تھا. انبیاء اس لئے آئے تاکہ فطرت بشر میں چھپے ہوئے خزانوں کو ظاہر کر دیں اور اس کی فطرت کو جو کہ خدا کی امانت ہے ثمر آور کریں. اور ہر قسم کے شرک و خرافات سے پاک اور صاف ایمان کی طرف اس کی راہنمائی کریں.
جب اکثر لوگوں نے خدا سے اپنے عہد و پیمان کو (جو توحید و خدا پرستی پر مبنی تھا) توڑ دیا اور اس (خدا) کے حق سے بے خبر ہو گئے اور خدا کے لئے شریک و مثل ٹھرانے لگے تو شیطان نے انہیں خدا کی معرفت سے منحرف کر دیا اور اس کی عبادت سے روک دیا تو خدا نے ان ہی کے درمیان سے انبیاء مبعوث کئے اور یہ سلسلہ بہت طویل عرصہ تک جاری رہا تاکہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں اور خدا کی فراموش شدہ نعمتیں انہیں یاد دلائیں.

۲. انسان کی آزاد طبیعت.

انسان کے فطری رجحانات میں سے ایک قید و بند سے آزادی اور زیادہ خواھی ہے. انسان مستقل لامتنایی کمال کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے غلط راستے اختیار کر لیتا ہے کیا وہ طاقت اور شہرت طلبی کے بل بوتے پر کسی مقام تک پہنچ سکتا ہے جو اس کے لیے کافی ہو؟ کیا اس نے مال جمع کرنے میں کہیں توقف کیا ہے؟ نہیں وہ تو لامتناہی کی تلاش میں ہے .ان ہی محدود و معین امور میں اس کی بھاگ دوڑ اور تگ و دو اس بات کی غماز ہے کہ وہ لامتناہی چیز کا طلب گار ہے. اسی اندرونی خواہش کی بناء پر وہ دنیا کے تمام جلوؤں کو لا محدود مقدار میں حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کی خواہشات کا آفتاب کسی بھی افق پر غروب نہیں ہوتا بلکہ جتنا زیادہ ملتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی خواہش کا شعلہ بھڑکتا ہے اور کثرت طلبی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے. عالم مادہ محدودیت کے تار و پود میں جکڑا ہوا ہے اس میں لا محدود کو تلاش نہیں کیا جا سکتا ہے. دوسری طرف انسان کی اندرونی فطرت کے لئے خارج میں کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کہ اسے لامتنایی سے باز رکھ سکتی ہیں مثلاً اس کی پیاس بجھانے کے لئے خارج میں پانی موجود ہے اور بھوک کے لئے کھانا ہے پس اس خواہش کو بھی دیگر خواہشات کی طرح پورا ہونا چاہیے لیکن چونکہ مادی دنیا محدود ہے لہٰذا وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتی اس خواہش کو وہی پورا کر سکتا ہے جو خود ہر لحاظ سے لا محدود ہو اس بنا پر انسان میں اس خواہش اور رجحان کا وجود ایک مطلق العنان ہستی کا پتہ دیتا ہے ایسا وجود، لا محدود وجود اور مادی خصوصیات سے پاک و پاکیزہ ہو تاکہ جو آدمی کی طنیت میں وسعت طلبی کا عشق ہے اور اس کا شعلہ اس کی خلقت کے وقت سے اس کے قلب میں بھڑک رہا ہے وہ اس کا جواب قرار پا سکے.

اگر یہ خواہش، عشق، شہرت طلبی، ثروت و قدرت کی جمع آوری میں استعمال ہو گی تو دوسری غلط راہ پر گامزن ہو جائے گی اور انسان کی خواہش پوری نہ ہو گی اور اضطراب و خوف اس کو گھیرے گا.
جو انسان عرصہ دراز سے مال و منال اور دنیا کے پر فریب جلوؤں کے پیچھے تھا وہ سخت جستجو کے بعد اور کمر شکن کام میں عمر گزارنے کے بعد خوف و ترس سے دوچار ہوتا ہے اگر وہ خاطر خواہ اور آرام سے زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اپنے وجود کی گہرائیوں سے دیگر چیزوں کا قلع قمع کر دے اور اس عشق سے پردے اٹھادے اور حضرت حق کی کامل عبادت اور اطاعت اور خود سپردگی کے ذریعہ سے اسے منور کر دے . اگر وہ لگاتار اس منزل سے اس منزل تک راستہ طے کرتا چلا جائے گا تو ساحل تک سلامت پہنچ جائے گا اور اس مطلق العنان ہستی سے جا ملے گا.

خلاصہ

۱. فطرت لغت میں سرشت اور طبیعت کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں ہر انسان کے معنوی جذبہ و خواہش کو فطرت کہا جاتا ہے.
۲. خدا جوئی ایک فطری احساس ہے کہ جس نے تصور خدا کو طول تاریخ میں انسان کے ساتھ ساتھ رکھا ہے.
۳. اس کے باوجود کہ خدا جوئی تمام انسانوں کی فطرت میں موجود ہے لیکن ممکن ہے مختلف اسباب کی وجہ سے اس پر پردے پڑ جائیں یا ظاہری طور پر اس کا نور خاموش ہو جائے.
۴. انسان کمال مطلق سے عشق کرتا ہے اور یہ بالفعل عشق بالفعل معشوق کے وجود کا پتہ دیتا ہے اور جب تک اسے نہیں پاتا آرام سے نہیں بیٹھتا.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چھٹا سبق

فطرت قرآن اور روایات کی نگاہ میں

بیچلر B.A

تمہید

جس طرح حیوانات بغیر سکھائے اور راستہ یاد کئے ہوئے پانی اور خوراک تک پہنچتے ہیں یا آشیانہ بناتے ہیں انسان بھی بغیر تعلیم کے قلب و دل کے راستے سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہنچانتا ہے اور اپنے وجود کے اندر اور روح کی گہرائی میں خدا سے عشق رکھتا ہے اور اسے پالیتا ہے اس سبق میں ہم اسی فطرت کو قرآن اور روایات کی نگاہ میں بیان کریں گے.

تفصیل

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عالم طبیعت پر بھرپور توجہ اور اس سے گہرے تعلق کے باعث اور مادی زندگی کے مسائل میں ڈوب جانے کی وجہ سے یہ خدا سے عشق اور اس سے لگاؤ والی صلاحیت حجاب میں چھپ جاتی ہے اور پھر اس وقت ظاہر ہوتی ہے اور خود کو پہچنواتی ہے جب انسان ہمیشہ اندرونی اور بیرونی عوامل سے متاثر ہوتا ہے . یہ عوامل انسان کے رجحانات پر چھا جاتے ہیں لوگوں کا ہر گروہ چند عوامل سے متاثر ہوتا ہے مثلاً حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، نفسانی خواہشات وغیرہ انسان کی تمام باطنی خواہشات اور رجحانات اپنے سے قوی تر میلانات کا اثر قبول کرتے ہیں. جب سخت حوادث سے دو چار ہوتا ہے جیسے شدید بیماری، ڈوبنے کا خطرہ، ہوائی جہاز کے گر پڑنے کا ڈر تو تمام موجودات سے انسان کی امید ٹوٹ جاتی ہے تو پھر یہ اندرونی شعلہ اور فطری کشش ظاہر ہوتی ہے اور انسان غیر اختیاری طور پر خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دعا کے لئے اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا دیتا ہے.

فطرت قرآن مجید کی نگاہ میں

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ [1]

جب بھی انسان کو کوئی رنج پہنچتا ہے تو اپنے پروردگار سے توبہ اور انابت کرتا ہے.

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ [2]

---

[1]. زمر/۸

[2]. روم/۳۳

اور جب لوگوں پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر اس کو پکارنے لگتے ہیں.

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا [1]

اور جب انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اپنے پہلو کے بل بیٹھا ہو یا کھڑا ہو ہم کو پکارتا ہے.

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ [2]

آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں تبدیلی نہیں آسکتی یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے.

فطرت روایات کی روشنی میں

قال رسول الله(ص). کل مولود یولد علی الفطرة حتیٰ یکون ابواه یهودانه او ینصرانه. [3]

ہر بچہ فطرت (توحید واسلام) پر پیدا ہوتا ہے مگر یہ کہ اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی بنادیتے ہیں.

عن زراره سالت ابا عبد الله علیه السلام عن قول الله عزوجل فطرة الله التی فطر الناس علیها. قال: فطرهم جمیعاً علی التوحید.

جناب زرارہ کہتے ہیں میں نے امام صادق علیہ السلام سے خدا کے اس قول (فطرة الله) کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ خدا نے سب کو فطرت توحید پر پیدا کیا ہے.

امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیت کریمہ میں فطرت سے کیا مراد ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسلام مراد ہے کیونکہ خدا نے جب انسانوں سے توحید اور معرفت خدا کا عہد کر لیا تھا اسی وقت ضرورت دین کو بھی ان کے وجود میں رکھ دیا تھا.

---

[1]. یونس/۱۲

[2]. روم/۳۰

[3]. بحار الانوار/ج ۳/ص ۲۸۱

عن علی ابن موسیٰ الرضا صلوات اللہ علیہ عن ابیہ عن جدہ محمد بن علی بن علی بن الحسن علیہم السلام فی قولہ. فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا: قال ھو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین علیہ السلام الی منہا التوحید.

امام رضا علیہ السلام اپنے والد بزرگوار سے انہوں نے اپنے جد امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا (فطرۃ اللہ) کے معنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین علیہ السلام ہیں یعنی خدا کی وحدانیت کے اقرار میں رسالت محمدی کا یقین اور ولایت امیر المومنین علیہ السلام کا اقرار بھی شامل ہے.

ابو بصیر نے امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے (فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا) سے مراد ولایت ہے.

۱. حقیقت امر یہ ہے کہ ہر انسان اپنے آپ میں ایک پیدا کرنے والے کا احساس کرتا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس کو خدا نے انسانوں کی سرشت و فطرت میں ودیعت کر دیا ہے. یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو غیر مسلم دانشوروں نے بھی قبول کیا ہے جن کے چند نمونوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے.

مذہبی فطرت اور دانشوروں کے نظریات

بغیر کسی استثناء کے عقیدہ اور مذہب سب میں پایا جاتا ہے اور میں اس کو پیدائشی مذہبی احساس کا نام دیتا ہوں اس مذہب میں انسان آرزوؤں اور مقاصد کے کم ہونے اور عظمت و جلال جو ان امور کے ماوراء اور مخلوقات میں پوشیدہ ہوتے ہیں ان کا احساس کرتا ہے. (انسٹن)

دل کے پاس کچھ ایسی دلیلیں ہیں کہ جہاں تک عقل کی رسائی نہیں ہے. (پاسکال)

میں بالکل کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مذہبی زندگی کا سرچشمہ دل ہے. (ویلیم جیمز)

ہمارے اسلاف نے بارگاہ خداوندی میں اس وقت سر کو جھکا دیا تھا جب وہ خدا کو کوئی نام بھی نہ دے سکتے تھے. (ماکس ورلر)

جو حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ عرفانی احساس ایک ایسی لہر ہے جو ہماری فطرتوں کی تہہ سے اٹھتی ہے اور در حقیقت وہی اصلی فطرت ہے. جس طرح انسان پانی اور آکسیجن کا محتاج ہے اسی طرح خدا کی ضرورت بھی ہے. (الکس کارل)

ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: یا بن رسول اللہ! خدا کی معرفت عطا کریں کیونکہ اہل مجادلہ (بحث کرنے والوں) نے ہم سے بہت ساری باتیں کی ہیں اور ہمیں پریشان کر کے رکھ دیا ہے آپ نے فرمایا: کہ

کیا تم کبھی کشتی پر سوار ہوئے؟ اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا: کیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تمہاری کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو اور اس وقت نہ کوئی دوسری کشتی اور نہ ہی کوئی شناگر (تیراک) ہو جو تم کو نجات دے سکے اس نے عرض کی جی ہاں.

آپ نے فرمایا: کیا اس وقت تم نے اس بات کا احساس نہیں کیا کہ اب بھی کوئی ایسی طاقت ہے جو تم کو ان خطرناک موجوں سے نجات دلا سکتی ہے اس نے کہا. ہاں، آپ نے فرمایا: وہی خدا ہے جو تم کو اس جگہ نجات دے سکتا ہے جس جگہ کوئی نجات دینے والا نہیں اور نہ کوئی فریاد رس ہے.

گویا یہ خدا شناسی کی فطرت وجود انسان کے بنیادی سرمایہ میں سے ہے جو کہ آئین ساز حقیقت کی راہنمائی کرتی ہے مگر بسا اوقات دنیا سے بہت زیادہ وابستگی اور تعلق یا فاسد ماحول بلکہ ایک لفظ میں یوں کہا جائے کہ گناہ، فطرت کو حقیقت نمائی سے روک دیتا ہے اور صاف شفاف آئینہ کو دھندلا اور غبار آلود کر دیتا ہے.

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ[1]

جن افراد نے بہت زیادہ گناہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا اور مسخرہ بنایا.

خلاصہ

۱. انسان کی فطرت میں عشق خدا رچا بسا ہے لیکن مادیت پسندی کی وجہ سے اور مادی زندگی کی جلوہ آرائیوں کے سبب اس رجحان پر پردہ پڑ جاتا ہے.

۲. سخت حوادث کے وقت جب انسان کی امیدیں تمام چیزوں سے منقطع ہو جاتی ہیں تو اس وقت فطرت کی آواز اس کے دل میں گونجنے لگتی ہے اور وہ خدا کو پکارنے لگتا ہے.

۳. فطرت کی حقیقت کے بارے میں متعدد آیات اور روایات میں بیان کیا گیا ہے. اور اسے انسانی حیات کا عظیم سرمایہ قرار دیا گیا ہے.

۴. ہر بچہ فطرت (توحید و اسلام) پر پیدا ہوتا ہے مگر یہ کہ اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں.

---

[1]. روم/۱۰

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

ساتواں سبق

برہان نظم

بیچلر B.A

تمہید

دنیا کی ہر چیز میں ایک خاص قسم کا نظام پایا جاتا ہے اور اس بات کا امکان بھی نہیں ہے کہ موجودات عالم میں پائے جانے والے نظم و نسق کی تردید کوئی بھی عاقل انسان کر سکے. کائنات کے مادی ذرات میں سب سے چھوٹی شیء (ایٹم) اور بڑی سے بڑی چیز کہکشاں ہے. سب جگہ اور ہر چیز میں ایک خاص نظم وضبط پایا جاتا ہے. اگر دنیا پر نظم کی حکمرانی نہ ہوتی تو دنیا کے بارے میں معلومات بھی حاصل نہ ہوتیں. کیونکہ علم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسے عمومی نظام و قوانین کی دریافت ہو جو دنیا پر حکم فرما ہیں. خداوند متعال کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ایک اہم دلیل برہان نظم ہے اس برہان کو ہم دو مقدموں کے ذریعہ بیان کریں گے.

تفصیل

گذشتہ دروس میں ہم نے بیان کیا ہے کہ فطری طور پر ہر انسان وجود خدا کو قبول کرتا ہے. لیکن اس کا معنی اور مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ خدا کے وجود پر کوئی دلیل اور برہان ذکر نہ کی جائے. یہی وجہ ہے کہ مکتب اسلام سے تعلق رکھنے والے علمائے علم کلام نے ہر دور میں وجود خدا کو ثابت کرنے کے لئے، بہت ساری دلیلیں ذکر کی ہیں. ان میں سے ایک اہم دلیل کو یہاں ذکر کرتے ہیں، اس دلیل کو "برہان نظم" سے یاد کیا جاتا ہے.

برہان نظم دو مقدموں پر مشتمل ہے:

۱. پوری کائنات میں منظّم اور منسجم قسم کے نظام پائے جاتے ہیں.
۲. ہر منظّم نظام کا کائی نہ کوئی ناظم ضرور ہوا کرتا ہے.

ان دو مقدموں کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ کائنات میں مختلف منظّم اور منسجم قسم کے نظام پائے جاتے ہیں کہ جن کا کوئی ناظم ضرور موجود ہونا چاہیئے. وجود خدا کے اثبات پر یہ برہان اتنی واضح اور روشن ہے کہ ہر انسان اس کے ذریعہ پوری کائنات کو نظم بخشنے والے یعنی ذات خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے. لیکن اگر اس برہان کو علمی اور منطقی انداز میں بیان کرنا چاہیں تو سب سے پہلے نظم کی تعریف اور پھر مذکورہ بالا دو مقدموں میں سے ہر ایک کی وضاحت ضروری ہے.

نظم کی تعریف: ایک معین اور مشخص ہدف اور غرض کی تکمیل کے لئے مختلف عناصر اور اجزا کا خاص مقدار اور خاص انداز میں اکٹھا ہو جانا نظم کہلاتا ہے.

مثال کے طور پر، گھڑی ایک منظّم چیز ہے. جس میں مختلف اجزاء اور عناصر ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع ہیں، تاکہ اس منظّم مجموعے کے ذریعہ وقت معلوم کیا جاسکے.

پہلا مقدمہ: ہمارا پہلا مقدمہ یہ تھا کہ پوری کائنات میں منظّم و منسجم قسم کے نظام پائے جاتے ہیں، جس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے، حتی کہ وہ لوگ جو خدا کے وجود کے منکر ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں. اور جتنی علمی ترقی ہو رہی ہے، اتنا ہی دانشور اور مختلف علوم کے ماہرین اقرار کرتے چلے آرہے ہیں کہ اس پوری کائنات کے چھوٹے چھوٹے ذرات سے لے کر منظومہ شمسی تک ہر چیز ایک خاص نظام کے تحت چل رہی ہے. اور ان میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے.

دوسرا مقدمہ: برہان نظم کا دوسرا مقدمہ بدیہی اور واضح ہے جسے ہر صاحب عقل تسلیم کرتا ہے. اور روزمرہ زندگی میں ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں. مثال کے طور پر جب بھی انسان کی نظر کسی بلند و بالا عمارت پر پڑتی ہے تو فوراً اس کا ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ کسی ماہر انجینئر نے اس کا نقشہ بنایا ہوگا اور کسی ماہر قسم کے معمار نے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق اس کی تعمیر کی ہے.

یا جس وقت ہم نہج البلاغہ یا صحیفہ سجادیہ کا مطالعہ کرتے ہیں، فوراً ہمارا ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ یہ کلمات اور فرامین، ایک ایسی زبان سے جاری ہوئے ہیں جو علم، دانش، فصاحت و بلاغت اور معرفت و حکمت کی بہت ہی عظیم درجہ پر فائز ہیں.

اس طرح کی بے شمار مثالیں ذکر کی جا سکتی ہیں، کہ جن کے بارے میں یہ خیال تک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چیزیں اتفاقی طور پر وجود میں آ گئی ہیں. اور انکا کوئی وجود میں لانے والا نہیں ہے.

نتیجہ یہ ہوا کہ انسان، اس منظّم اور منسجم نظام کو دیکھ کر اقرار کرتا ہے کہ کوئی ذات ہے جس نے اسے نظم بخشا ہے. جو صاحب علم و قدرت ہے. ہر منظّم چیز یہ بتلا رہی ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہونا چاہئے اور وہ ناظم صاحب علم و قدرت اور حکمت ہے[1].

---

[1]. برہان نظم، شیروانی، ص ۸۹، ۸۸، ۸۷

خلاصہ

۱. پوری کائنات میں منظّم اور منسجم قسم کے نظام پائے جاتے ہیں.
۲. ہر منظّم نظام کا کوئی نہ کوئی ناظم ضرور ہوتا ہے.
۳. ایسے ناظم کا عالم اور قادر ہونا بھی ضروری ہے.
۴. ایک معین اور مشخص ہدف اور غرض کی تکمیل کے لیے مختلف عناصر اور اجزاء کا خاص مقدار اور خاص انداز میں اکٹھا ہونا نظم کہلاتا ہے.
۵. کائنات میں پایا جانے والا نظم وجود خدائے متعال پر بہترین دلیل ہے.
۶. کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات سے لے کر منظومہ شمسی تک ہر چیز اسی کے نظم و قدرت سے چل رہی ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

آٹھواں سبق

برہان امکان و وجوب

بیچلر B.A

تمہید

اسلامی فلاسفہ اور متکلمین نے اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے دلائل اور براہین پیش کئے ہیں جن کو سمجھنا دشوار ہے ہم یہاں پر ایک ایسی برہان کو بیان کریں گے جسے سمجھنے کے لئے معمولی مقدمات کی ضرورت ہے لیکن یہ دلیل صرف خدا کے واجب الوجود ہونے کو ثابت کرتی ہے بقیہ صفات الٰہی کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہے.

تفصیل

گزشتہ سبق میں خدا کے وجود پر متکلمین کی طرف سے بیان کئے گئے عقلی دلائل اور براہین میں سے برہان نظم کو بیان کیا جا چکا ہے. جس میں نظم کی تعریف اور برہان نظم کے مقدموں کے ذریعے، خدا کے وجود کو ثابت کیا تھا. اس سبق میں ہم خدا کے وجود پر ایک اور دلیل ذکر کرتے ہیں، جسے "برہان امکان و وجوب" سے تعبیر کیا جاتا ہے. اس برہان کو بیان کرنے سے پہلے ان عقلی اور فلسفی مقدمات اور مبادی کی وضاحت ضروری ہے کہ جسن پر یہ برہان استوار ہے اور ان کو سمجھنے سے پہلے اس کا سمجھنا ممکن نہیں ہے.
لہٰذا ہم سب سے پہلے مختصر طور پر ان مبادی اور مقدمات کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر اصلی برہان کو بیان کریں گے.

پہلا مقدمہ: موجود یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود.

ہر وہ چیز جسے موجود کہا جا سکتا ہو وہ دو حال سے خارج نہیں ہے. یا تو اس کے لئے وجود ضروری ہے یعنی وہ خود بخود موجود ہے کہ جسے فلسفہ و علم کلام کی اصطلاح میں واجب الوجود کہتے ہیں. یا پھر اس کے لئے وجود ضروری نہیں ہے، بلکہ وہ کسی دوسرے وجود کی برکت سے وجود میں آیا ہے. اسے اصطلاح فلسفہ و علم کلام میں ممکن الوجود کہتے ہیں.
لہٰذا وجود کی طرف نسبت دیتے ہوئے ہر موجود یا واجب الوجود ہوتا ہے یا ممکن الوجود.

دوسرا مقدمہ: قانون علیت.

واجب الوجود اور ممکن الوجود کی تعریف کو مد نظر رکھتے ہوئے قانون علیت کی وضاحت کے لئے عرض یہ ہے کہ اصل اور قانون علیت سے مراد یہ ہے کہ ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہے. اس لئے کہ ممکن الوجود کی نسبت وجود اور عدم کی طرف یکساں ہے. یعنی اس کا خارج میں موجود ہونا یا نہ ہونا برابر ہے. لہٰذا اس قسم کے موجود کو وجود میں آنے کے لئے مرجح (یعنی وہ سبب جو اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دے) کا ہونا ضروری ہے. باالفاظ دیگر، ایک ایسی علت کا ہونا ضروری ہے جو اسے عدم سے وجود میں لے آئے.

اس بنا پر ہم واجب الوجود اور ممکن الوجود کی ایک اور تعریف بیان کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ واجب الوجود وہ موجود ہے جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہ ہو ممکن الوجود وہ ہے جو غیر کا محتاج ہو.

مذکورہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل اور قانون علیت ممکن الوجود کے ساتھ مربوط ہے.

تیسرا مقدمہ: تسلسل محال ہے.

برہان وجوب اور امکان کے مقدمات اور مبادی میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ علتوں اور معلول کا تسلسل یعنی بے نہایت حد تک چلا جانا اور کسی بھی آخری علت پر نہ رکنا محال ہے.

آسان لفظوں میں اگر ہم تسلسل کو سمجھنا چاہیں تو یوں بیان کریں گے .

اگر الف، ب پر موقوف ہو اور ب، ج پر اور ج، د پر اور یہ سلسلہ ختم بھی نہ ہو، ایسا ممکن نہیں ہے یعنی کسی بھی سلسلہ کا کوئی نکتہ انجام ہونا چاہئے. اور یہ بات واضح اور بدیہی ہے. اگرچہ بعض علماء نے تسلسل کے محال ہونے پر عقلی دلائل اور براہین ذکر کیے ہیں.

ان عقلی اور فلسفی مقدمات کی وضاحت کے بعد اب ہم برہان امکان و وجوب کو بیان کر سکتے ہیں.

گذشتہ بیانات کی روشنی میں ہر وہ چیز جسے موجود کہا جا سکتا ہو، وہ دو حال سے باہر نہیں، یا تو اس کے لئے وجود ضروری ہے یعنی وہ خود بخود موجود ہے، یا پھر اس کے لئے وجود ضروری نہیں ہے، یعنی خود بخود موجود نہیں بلکہ کسی دوسرے وجود کی وجہ سے وجود میں آئی ہے. پہلی قسم کے موجود کو واجب الوجود اور دوسری قسم کے موجود کو ممکن الوجود کہتے ہیں.

وجود کی ان دونوں قسموں میں غور و فکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شئی ممکن الوجود ہو یعنی اس مفہوم کا مصداق ہو، وہ علت کی محتاج ہو گی. اس لئے کہ جب کوئی موجود خود بخود وجود میں نہ آیا ہو تو مجبورا کسی دوسرے موجود کے ذریعے ہی وہ وجود میں آ سکتا ہے یعنی اگر ایک موجود، وجود بالذات نہیں رکھتا تو اس کا وجود، وجود بالغیر ہے.

ایک اہم بات

بعض لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ "اصل علیت" کا معنی اور مفہوم یہ ہے کہ ہر موجود کو علت کی ضرورت ہے، لہٰذا ان لوگوں نے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ اگر ہر موجود کو کسی علت کی ضرورت ہے تو اللہ تعالی بھی تو موجود ہے، تو کیا اللہ تعالی کو بھی علت کی ضرورت ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ اصل علیت مطلق نہیں ہے یعنی ہر وجود رکھنے والی چیز سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس کا موضوع "ممکن الوجود" ہے جس کو موجود ہونے کے لئے غیر یعنی واجب الوجود کی ضرورت ہوتی ہے. ورنہ واجب الوجود کو موجود ہونے کے لئے کسی غیر کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ خود ہی اپنے وجود کی دلیل ہے.

خلاصہ

۱. عقلی لحاظ سے موجودات کی دو قسمیں ہے.
۲. **واجب الوجود**. جس کا وجود ضروری اور کسی پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہے.
۳. **ممکن الوجود**. جس کے وجود کے لئے کسی پیدا کرنے والے (علت) کی ضرورت ہوتی ہے ہر ممکن الوجود کا کسی واجب الوجود پر اختتام ضروری ہے.
۴. منطقی لحاظ سے کسی بھی موضوع کے لئے محمول کا ثابت ہونا تین حالتوں سے خارج نہیں ہے. امتناع، ضرورت (وجوب)، امکان، لیکن فلسفی رو سے ممتنع و محال کبھی بھی وجود خارجی سے متصف نہیں ہو سکتا لذا موجود کو دو قسموں واجب الوجود اور ممکن الوجود میں تقسیم کیا گیا ہے.

۵. فلسفی اصطلاح میں محتاج موجود کو معلول، اور دوسرے کو علت کہا جاتا ہے.

۶. ہر ممکن الوجود کو علت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایک موضوع کے لئے وجود کا ثابت ہونا بالذات ہے یا بالغیر، اگر بالذات نہیں تو ضرور بالغیر ہے لہٰذا ہر ممکن الوجود خود بخود وجود سے متصف نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسری شیء کے ذریعہ وجود سے بہرہ مند ہوتا ہے.

۷. ہر موجود علت کا محتاج نہیں ہے بلکہ ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہے.

۸. علتوں کا تسلسل محال ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

نواں سبق

خدا کی صفات

بیچلر B.A

تمہید

جس طرح شناخت خداوند متعال اور اس کے وجود کا جاننا آسان ہے اتنا ہی اس کے صفات سے آگاہی حاصل کرنا مشکل ہے . کیونکہ اس کی صفات کی پہچان کے لیے غور و خوض اور دقت نظر کی ضرورت ہے تاکہ تشبیہ اور قیاس آرائی سے بچا جاسکے . اس سبق میں صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ کے بارے میں بتاتے ہوئے سلسلہ بحث کو آگے بڑھائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیں گے کہ موجودات کو وجود بخشنے والی علت کیا ہے اور اس کی خصوصیات کے بارے میں بحث کریں گے .

تفصیل

گزشتہ دروس میں فلسفی اور عقلی دلائل کے ذریعے ہم نے یہ ثابت کیا کہ ذات باری تعالی واجب الوجود ہے، اور وہ اپنے وجود میں کسی شئے کا محتاج نہیں ہے. لیکن اس مقدس ذات کا صرف واجب الوجود کی حد تک جاننا کافی نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس کی مخصوص صفات کے ذریعے اس کی معرفت حاصل کی جائے تاکہ اس ذات کو مخلوقات کے دائرہ سے الگ ہو کر پہچانا جائے. پس اس غرض کے حصول کی خاطر خدا کی ثبوتی اور سلبی صفات کا جاننا ضروری ہے. تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ لائق پرستش اور عبادت ہے. اور مخلوقات میں پائی جانے والی صفات سے منزہ ہے.

گذشتہ دروس میں ہم نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ فلسفی دلائل کا نتیجہ ایک ایسے موجود کا ثابت کرنا ہے جو بعنوان (واجب الوجود) ہے اور دوسرے دلائل کے ذریعہ اس کے سلبی اور ثبوتی صفات کو ثابت کیا جاتا ہے تاکہ خداوند عالم اپنے مخصوص صفات کے ذریعہ مخلوقات کے دائرے سے الگ ہو کر پہچانا جائے، اس لئے کہ معرفت کے لئے صرف واجب الوجود کی حثیت سے جاننا کافی نہیں ہے، کیوں ؟اس لئے کہ ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ مادہ یا انرجی (قوت و طاقت) بھی واجب الوجود کا مصداق بن سکتے ہیں، لہٰذا اس کی سلبی صفات ثابت ہونا چاہییں تاکہ اس طرح یہ معلوم ہو جائے کہ واجب الوجود کی ذات، اُن صفات سے منزہ ہے جو مخلوقات میں پائی جاتی ہیں اور اس کی صفات مخلوقات پر صادق نہ آسکتی ہوں . اسی طرح اس کی صفات ثبوتیہ کا بھی ثابت ہونا ضروری ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ لائق پرستش و عبادت ہے، اور دوسرے عقائد، نبوت، معاد اور فروع کے اثبات کا راستہ آسان ہو جائے.

گذشتہ برہان و دلیل سے یہ ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود کو علت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ممکنات کے لئے خود علت ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق واجب الوجود کے لئے دو صفت ثابت ہیں ایک یہ کہ وہ ہر شی سے بے نیاز ہے، اس لئے کہ اگر اس میں معمولی سی احتیاج بھی پائی گئی تو وہ جس شی کا محتاج ہوگا وہ شیء اس کی علت بن جائے گی، کیونکہ بخوبی ہمیں معلوم ہے کہ (فلسفی اصطلاح) میں علت کے معنی یہی ہیں کہ تمام موجودات اس کے محتاج ہوں اور دوسرا یہ کہ ممکن الوجود شی اس کی طرف نسبت دیتے ہوئے معلول ہیں، اور اس کی ذات تمام اشیاء کی پیدائش کی سب سے پہلی علت ہے.

ان دو نتیجوں کے بعد ان کے لوازمات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ کو پیش کریں گے، البتہ انھیں ثابت کرنے کے لئے فلسفی اور کلامی کتابوں میں متعدد دلیلیں ذکر کی گئی ہیں، اسی لئے ہم یہاں صرف اس بات کو آسانی سے سمجھنے کے لئے اور سلسلہ کلام کو ربط دیتے ہوئے انہی دلائل کو ذکر کریں گے جو گذشتہ براہین سے مربوط ہوں.

خدا کا ازلی و ابدی ہونا

اگر کوئی موجود کسی دوسرے موجود کا معلول اور اس کا محتاج ہو تو پھر اس کا وجود اسی کا تابع کہلائے گا اور علت کے جاتے ہی اس کا وجود مٹ جائے گا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کسی بھی موجود کا معدوم ہو جانا، اس کے ممکن الوجود ہونے کی علامت ہے، اور چونکہ واجب الوجود کا وجود خود بخود ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا ہے لہٰذا وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی بھی رہے گا.

اسی طرح واجب الوجود کے لئے دو صفتیں اور ثابت ہوتی ہیں، ایک اس کا ازلی ہونا، یعنی گذشتہ ادوار میں بھی تھا، اور دوسرا ابدی ہونا یعنی وہ مستقبل میں بھی باقی رہے گا، اور کبھی کبھی ان دونوں اصطلاحوں کو ایک کلمہ (سرمدی) کے تحت بھی بیان کیا جاتا ہے.

لہٰذا ہر وہ موجود جس میں سابقۂ عدم یا امکان زوال ہو وہ کبھی بھی واجب الوجود نہیں ہو سکتا لہٰذا اس طرح سے تمام مادی قضایا کے واجب الوجود ہونے کا مفروضہ باطل ہو جاتا اور اس کا باطل ہونا بہت زیادہ واضح و روشن ہے.

صفات سلبیہ

واجب الوجود کے لوازمات میں سے ایک صفت بساطت اور اس کا مرکب نہ ہونا ہے، اس لئے کہ ہر مرکب شی کا اس کے اجزاء کی جانب محتاج ہونا واضح ہے، جبکہ واجب الوجود ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ہے.

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ واجب الوجود کے اجزاء بالفعل نہیں ہیں، بلکہ ایک لکیر کے ضمن میں دو لکیروں کا فرض کرنا ہے، تو یہ فرض بھی باطل ہے، اس لئے کہ وہ چیز جو بالقوہ اجزاء کی مالک ہو وہ عقلاً تجزیہ کے قابل ہوگی، اگرچہ وہ خارج میں متحقق نہ ہو اور تجزیہ کے ممکن ہونے کا مطلب تمام امکان کا زائل ہونا ہے، چنانچہ اگر ایک میٹر لمبی لکیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے بعد وہ ایک میٹر لمبی لکیر نہیں رہ سکتی، اور یہ مطلب ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ واجب الوجود کے لئے زوال نہیں ہے.

اور چونکہ بالفعل اجزاء سے مرکب ہونا اجسام کا خاصہ ہے، لہٰذا اس سے یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی جسمانی موجود، واجب الوجود نہیں ہو سکتا یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کے ذریعہ خدا کا مجرد ہونا اور جسمانی نہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے، نیز یہ مطلب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ ذات خداوند متعال کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا اور ظاہری وسائل سے محسوس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ محسوس ہونا اجسام و جسمانیات کے خواص میں سے ہے جسمانیت کی نفی کے ذریعہ اجسام کے اپنے تمام خواص جیسے مکان و زمان سے متعلق ہونا بھی واجب الوجود سے سلب ہو جاتا ہے، اِس لئے کہ مکان اُس کے لئے متصور ہے جس میں حجم و امتداد ہو، اسی طرح ہر وہ شی جس میں زمانہ پایا جاتا ہو وہ لحظہ اور امتداد زمانہ کے لحاظ سے قابل تجزیہ ہے اور یہ بھی ایک قسم کا امتداد اور اجزاء بالقوہ کی ترکیب ہے، لہٰذا خدا کے لئے مکان و زمان کا تصور باطل ہے اور کوئی بھی مکان و زمان سے متصف موجود، واجب الوجود نہیں ہو سکتا.

بنابریں، واجب الوجود سے زمانہ کی نفی کے ذریعہ حرکت و تغیر اور تکامل (کمال کی طرف جانے) کا تصور بھی باطل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ زمان کے بغیر کوئی بھی حرکت اور تغیر غیر ممکن ہے.

لہٰذا وہ لوگ جو خدا کے لئے مکان، جیسے عرش کے قائل ہوئے ہیں، یا اس سے حرکت اور آسمان سے نزول کی نسبت دی ہے یا اُسے آنکھوں سے قابل دید سمجھا ہے، یا اسے قابل تغیر اور حرکت جانا ہے، دراصل ان لوگوں نے خدا کو بخوبی درک نہیں کیا ہے.[1]

---

[1]. مکان رکھنا، آسمان سے نازل ہونا اور آنکھوں سے دیکھائی دینے کا عقیدہ بعض اہل سنت کا ہے، تغیر و تکامل کا نظریہ فلاسفہ غرب کی ایک جماعت کا ہے جن میں سے ھگل، برگسوں اور ویلیام جیمز ہیں، لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تغیر اور حرکت کی نفی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ساکن ہے بلکہ اس کی ذات کے ثبات کے معنی میں ہے اور ثبات، تغیر کی نقیض ہے، لیکن سکون حرکت کے مقابلہ میں عدم ملکہ ہے، اور اس چیز کے علاوہ کہ جس میں حرکت کی قابلیت ہو کسی دوسری شی کے لئے نہیں بولا جاتا

کلی طور پر ہر وہ مفہوم جو کسی بھی انداز میں نقص، محدودیت یا احتیاج پر دلالت کرے خدا کے لئے منتفی ہے، اور صفات سلبیہ کا مطلب بھی یہی ہے.

موجودات کو وجود بخشنے والی علت

گذشتہ دلیل کے ذریعہ جو مطلب واضح ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ واجب الوجود ممکنات کی پیدائش کا سبب ہے، اب اس کے بعد اس مطلب کے دوسرے پہلو کے سلسلہ میں بحث کریں گے، پہلے مرحلہ میں علت کی اقسام کی ایک مختصر وضاحت کرنے کے بعد علیّت الٰہی کی خصوصیات بیان کریں گے.

علت اپنے عام معنی میں ہر اس موجود کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسرے موجود سے وابستہ اور اس کے مد مقابل ہو، یہاں تک کہ یہ شروط اور مقدمات[1] کو بھی شامل ہے اور خدا کے علت نہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی بھی موجود سے وابستہ نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے کسی قسم کی شرط کا تصور نہیں کیا جاسکتا.

لیکن مخلوقات کے مقابلہ میں خدا کے علت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلقت کو وجود بخشنے والا ہے، جو علیت فاعلی کی ایک خاص قسم ہے، اس مطلب کی وضاحت کے لئے ہم مجبور ہیں کہ علت کی اقسام کو اجمالاً بیان کریں، اور اس کی تفصیلی وضاحت کو فلسفی کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں.

ہمیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ ایک سبزے کے اُگنے اور بڑھنے کے لئے مناسب بیج، زمین، خاک، آب و ہوا وغیرہ کی ضرورت ہے، اور یہ بھی طبیعی ہے کہ اسے کوئی زمین میں بوئے، اور اس کی آبیاری کرے، مذکورہ علّت کی تعریف کے مطابق جو کچھ ذکر کیا گیا وہ سبزے کے رشد و نمو کی علتیں ہیں.

ان مختلف علتوں کو مختلف نظریات اور عقائد کے تحت چند اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کا ہمیشہ ہونا وجود معلول کے لئے ضروری ہے (علت حقیقی) اور علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کی بقا، معلول کی بقا کے لئے لازمی نہیں ہے (جیسے سبزہ کے لئے کسان) (علت اعدادی) یا (معدات) کہا جاتا ہے، اسی طرح جانشین پذیر علتوں کو (علت جانشینی) اور بقیہ علتوں کو (علت انحصاری) کا نام دیا جاتا ہے.

لیکن ایک علّت اور بھی ہے جو ان تمام علتوں سے متفاوت ہے جسے سبزہ کی رشد کے لئے ذکر کیا گیا ہے، اور اسے بعض نفسانی قضایا میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جب انسان اپنے ذہن میں کسی کی صورت کو خلق کرتا ہے یا کسی امر کے انجام دینے کا ارادہ بناتا ہے تو اس کے ساتھ فوراً ہی ایک نفسانی اثر بنام (صورت ذہنی) اور (ارادہ) متحقق ہوتا

---

[1]. علل اعدادی کو کہا جاتا ہے.

ہے کہ جس کا وجود، نفس کے وجود سے وابستہ ہے اسی وجہ سے اُسے اس کا معلول مانا جاتا ہے، لیکن معلول کی یہ قسم ایسی ہے کہ جو اپنی علت سے کسی بھی اعتبار سے مستقل و بے نیاز نہیں ہے اور وہ کبھی بھی اس سے جدا ہو کر مستقل نہیں رہ سکتی، اس کے علاوہ نفس کی فاعلیّت، صورت ذہنی یا ارادہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے ان شرائط سے مشروط ہے کہ جس کی وجہ سے نقص، محدودیّت اور ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے، لہٰذا کائنات کے لئے واجب الوجود کی فاعلیت قضایائے ذہنی کے لئے نفس کی فاعلیت سے بالاتر ہے کہ جس کی نظیر تمام فاعلوں میں نہیں ملتی اس لئے کہ وہ کسی بھی احتیاج کے بغیر اپنے اس معلول کو وجود میں لاتا ہے کہ جس کی تمام ہستی اس سے وابستہ ہے.

خلاصہ

۱. واجب الوجود کو علت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ ممکنات کیلیے خود علت ہے.
۲. ہر مرکب شی کا اسکے اجزاء کی جانب محتاج ہونا واضح ہے جبکہ واجب الوجود ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ہے.
۳. موجود کا معدوم ہو جانا اسکے ممکن الوجود ہونے کی علامت ہے.
۴. واجب الوجود کی ذات سے زمانہ کی نفی کے ساتھ ساتھ حرکت، تغیر و تبدل اور تکامل کا تصور کرنا بھی باطل ہو جاتا ہے.
۵. علت سے مراد ایک موجود کا دوسرے موجود سے وابستہ اور اس کے مد مقابل ہونا ہے.
۶. مخلوقات کے مقابلہ میں خدا کے علت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلقت کو وجود بخشنے والا ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

دسواں سبق

صفات ذاتیہ

بیچلر B.A

تمہید

ہمیں یہ معلوم ہے کہ خداوند عالم علت وجود آفرین کائنات ہے، جس میں تمام کمالات جمع ہیں اور موجودات میں پائی جانے والی تمام صفتیں اور کمالات اسی کی ذات سے وابستہ ہیں، لیکن بندوں میں کمالات کے افاضہ سے اس کے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، تقریب ذہن کے لئے اس مثال کا سہارا لیا جاسکتا ہے، کہ استاد اپنے شاگرد کو جو کچھ اپنے علم سے فائدہ پہنچاتا ہے اس کی وجہ سے استاد کے علم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، البتہ خدا کی جانب سے وجود اور وجودی کمالات کا افاضہ اس مثال سے کہیں زیادہ بالاتر ہے، شاید اس ضمن میں سب سے واضح تعبیر یہ ہو کہ عالم ہستی ذات مقدس الٰہی کا جلوہ ہے، جسے اس آیت کریمہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے،

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ [1] خدا تو سارے آسمان اور زمین کا نور ہے.

تفصیل

الٰہی کمالات کے لامتناہی ہونے کے پیش نظر ہر وہ مفہوم جو نقص و محدودیت سے پاک ہو اور کمال ہونے پر دلالت کرتا ہو اسے خدائے وحدہٗ لاشریک کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآنی آیات اور ائمہ معصومین کی طرف سے صادر ہونے والی احادیث، ادعیہ، اور مناجاتوں میں نور، کمال، جمال، محبت اور بہجت جیسے مفاہیم استعمال ہوئے ہیں، لیکن جو کچھ فلسفہ و کلام کتابوں میں صفات الٰہی کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، (صفات ذاتیہ اور فعلیہ) لہٰذا پہلے مرحلہ اول میں اس تقسیم کی وضاحت کے بعد، ان میں سے اہم ترین صفات کے سلسلہ میں بحث کریں گے.

صفات ذاتیہ اور فعلیہ.

وہ صفات جسے خدا کی ذات سے نسبت دی جاتی ہے وہ یا تو وہ مفاہیم ہیں جو ذات احدیت میں موجودہ کمالات سے حاصل ہوتے ہیں جیسے حیات، علم اور قدرت، یا پھر وہ مفاہیم ہیں جو عبد اور معبود کے درمیان رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں جیسے خالقیت، رازقیت، لہٰذا پہلی قسم کو صفات ذاتیہ اور دوسری قسم کو صفات فعلیہ کہا جاتا ہے.

---

[1]. نور/۳۵

صفات کی ان دو قسموں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں، خدا ان صفات کے لئے عینی مصداق ہے لیکن دوسری قسم میں خالق و مخلوق کے درمیان موجودہ نسبت کی حکایت ہے، ذات الٰہی اور مخلوقات دو طرفہ حثیت سے پہچانے جاتے ہیں، جیسے کہ صفت خالقیت مخلوقات کی ذات، وجود خدا سے وابستگی کی بنا پر اخذ ہوتی ہے اور اس نسبت کی تشکیل اس کی دو طرفہ، خدا، و مخلوق سے ہوتی ہے خارج میں ذات مقدس الٰہی اور مخلوقات کے علاوہ کسی تیسری شیء کا کوئی وجود نہیں ہے، البتہ خداوند متعال خلقت کی قدرت سے متصف ہے لیکن (قدرت) اس کی ذاتی صفات میں سے ہے اور ,, خلق کرنا،، ایک ایسا مفہوم ہے جو اضافی ہونے کے ساتھ مقام فعل سے ظہور میں آتا ہے، اسی وجہ سے (خالقیت) کا شمار صفات فعلیہ میں کیا جاتا ہے، مگر یہ کہ (خلق پر قادر) ہونے کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں اس کی بازگشت بھی صفت قدرت کی طرف ہوگی.

حیات، و علم اور قدرت خدا کی مہم ترین صفات ذاتیہ میں سے ہیں، لیکن اگر سمیع و بصیر بہ معنی، سنی اور دیکھی جانے والی چیزوں کا علم رکھنے والا ہو، یا سمع و ابصار کے معنی میں ہوں تو ان صفات کی بازگشت علیم و قدیر ہے اور اگر ان صفات کا مطلب بالفعل دیکھنا اور سننا ہو جو سنی اور دیکھی جانے والی اشیا اور سننے اور دیکھنے والوں کے درمیان موجودہ رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں تو انھیں صفات فعلیہ میں سے شمار کیا جائے گا، جیسا کہ کبھی (علم) بھی اسی عنایت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسے (علم فعلی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے.

بعض متکلمین نے کلام اور ارادہ کو بھی صفات ذاتیہ میں سے شمار کیا ہے کہ جن کے سلسلہ میں آئندہ بحث کی جائے گی.

صفات ذاتیہ کا اثبات

قدرت و حیات اور علم الٰہی کو ثابت کرنے کے لئے سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ جب ان مفاہیم کو مخلوقات کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے تو یہ اوصاف اس کے کمالات پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا ان صفات کی علت یعنی ذات الٰہی میں، بطور کامل ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ مخلوقات میں پائی جانے والی تمام صفات و کمالات خدا کی طرف سے ہیں لہٰذا عطا کرنے والے کے پاس ایسے اوصاف ہونا ضروری ہیں تاکہ وہ دوسروں کو عطا کرسکے، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حیات عطا کرنے والا خود حیات سے سرفراز نہ ہو، یا مخلوقات کو علم و قدرت عطا کرنے والا خود جاہل و ناتواں ہو لہٰذا مخلوقات میں مشاہدہ ہونے والے کمالات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا بھی ان

کمالات کا بغیر کسی کمی و کسر کے حامل ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق خدا لامتناہی علم و قدرت اور حیات کا مالک ہے، اب اس کے بعد ان صفات کی وضاحت کرتے ہیں.

حیات

حیات کا مفہوم دو طرح کی مخلوقات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ایک سبزہ اور گھاس پھوس جن میں رشد و نمو کی صلاحیت ہوتی ہے، دوسرے حیوان اور انسان کہ جو ارادہ اور شعور سے متصف ہیں لیکن پہلا معنی، نقص و احتیاج کا مستلزم ہے اس لئے کہ رشد و نمو کا لازمہ یہ ہے کہ موجود اپنے آغاز میں اس کمال سے عاری ہو، بلکہ خارجی عوامل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے تغیرات سے آہستہ آہستہ کمالات کا مالک بن جائے، اور ایسا امر خدا سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ صفات سلبیہ میں گذر چکا ہے.

لیکن حیات کا دوسرا معنی، ایک کمالی مفہوم ہے، ہر چند اس کے امکانی مصادیق نقص کے ہمراہ ہیں لیکن پھر بھی اس کے لئے لامتناہی مقام فرض کیا جاسکتا ہے، کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیت اور نقص کا شائبہ نہ ہو، جیسا کہ مفہوم وجود اور مفہوم کمال میں بھی ایسا ہی ہے.

حیات اپنے اس معنی میں کہ جو علم اور فاعلیت ارادی کا ملازم ہے یقیناً وجود غیر مادی ہوگا اگرچہ حیات کو مادی امور یعنی جاندار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اصل میں وہ اروح کی صفت ہے اور بدن کا روح سے رابطہ ہونے کی وجہ سے حیات کو بدن سے متصف کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جس طرح امتداد، شی جسمانیت کا لازمہ ہے، حیات بھی وجود مجرد (غیر جسمانی) کا لازمہ ہے لہٰذا اس طرح حیات خدا پر ایک اور دلیل ایک دلیل متحقق ہو گئی اور وہ یہ ہے کہ ذات مقدس الٰہی مجرد اور غیر جسمانی ہے جیسا کہ گذشتہ دروس میں اسے ثابت کیا جاچکا ہے اور ہر موجود مجرد، حیات سے سرفراز ہے، لہٰذا اس طرح خدا متعال بھی ذاتاً حیات کا مالک ہے.

علم

علم کا مفہوم تمام مفاہیم میں ہر ایک سے زیادہ واضح و روشن ہے، لیکن مخلوقات کے درمیان اس کے مصادیق محدود اور ناقص ہیں، لہٰذا ان خصوصیات کے ساتھ یہ خدا پر قابل اطلاق نہیں ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ

عقل میں اتنی توانائی ہے کہ وہ اس مفہوم کمالی کے لئے ایک ایسے مفہوم کا انتخاب کرے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیتاور نقص نہ ہو بلکہ عالم ہونا اس کی عین ذات ہو، علم خدا کے ذاتی ہونے کے یہی معنی ہیں.

خدا کے علم کو متعدد راستوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے، ایک وہی راستہ ہے کہ جس کی طرف تمام صفات ذاتیہ کے اثبات کے لئے اشارہ کیا جاچکا ہے، یعنی چونکہ مخلوقات کے درمیان علم پایا جاتا ہے لہٰذا خالق کی ذات میں اس کی کامل صورت کا ہونا ضروری ہے.

دوسرا راستہ دلیل نظم کی مدد سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک مجموعہ جس قدر نظم و ضبط کا حامل ہوگا اتنا ہی اس کے ناظم کے علم پر دلالت کرے گا، جس طرح سے کہ ایک علمی کتاب یا خوبصورت شعر یا کوئی نقاشی (آرٹ) وجود بخشنے والے کے ذوق اور اس کے علم و دانش پر دلالت کرتے ہیں اور کبھی بھی کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک فلسفی یا کوئی علمی کتاب کسی جاہل یا نادان شخص کے ہاتھوں لکھی گئی ہوگی لہٰذا کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایسا نظم یافتہ جہان کسی جاہل موجود کا خلق کردہ ہے؟!

تیسرا راستہ نظریجو ہے مقدمات فلسفی (غیر بدیہی) کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہ قاعدہ کہ ہر موجود جو مستقل ہو اور مجرد عن المادہ ہو وہ علم سے متصف ہوگا جیسا کہ یہ امر اس سے مربوط کتابوں میں ثابت کیا جاچکا ہے.

علم الٰہی کی طرف توجہ دینا خود سازی کے ,, باب،، میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے.

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ [1] خدا خائن آنکھوں اور دل کے رازوں سے آگاہ ہے.

قدرت

وہ فاعل کہ جو امور کو اپنے ارادہ سے انجام دیتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے امور میں صاحب "قدرت" ہے، لہٰذا قدرت یعنی فاعل مختار کا ہر اس امر کو انجام دینے کا ارادہ کہ جس کا اس سے صادر ہونے کا امکان ہے، جو فاعل جس قدر مرتبہ وجودی کی رو سے کامل ہوگا اس کی قدرت بھی اتنی ہی وسیع ہوگی، پس جو فاعل اپنے کمال میں لامتناہی ہو اس کی قدرت بھی بے نہایت ہوگی.

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. [2] خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے.

---

[1]. غافر/۱۹

[2]. بقرہ/۲۰ اور دوسری آیات

اس مقام پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے.

۱. جو امر قدرت سے متعلق ہوگا اس میں امکان تحقق کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا جو شی اپنی ذات کے اعتبار سے محال ہو وہ قدرت کا متعلق نہیں بن سکتی، اور خدا کا صاحب قدرت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اپنی مثل بھی خلق کر سکتا ہے (اس لئے کہ خدا خلق نہیں کیا جاسکتا) یا دو کا عدد دو ہوتے ہوئے تین سے بڑا ہو جائے، یا ایک فرزند کو فرزند ہوتے ہوئے باپ سے پہلے خلق کردے.

۲. ہر کام کے انجام دینے کی قدرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان سب کو انجام دے، بلکہ وہ جسے چاہے گا انجام دے گا، اور جسے چاہے گا انجام نہیں دے گا حکیم خدا، حکیمانہ فعل کے علاوہ کوئی اور فعل انجام نہیں دے سکتا اگرچہ وہ غیر حکیمانہ امور کے انجام دینے پر بھی قادر ہے، انشاء اللہ آئندہ دروس میں حکمت خدا کے سلسلے میں مزید وضاحت کی جائے گی.

۳. قدرت کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس میں اختیار کے معنی بھی ہیں، خدا جس طرح بے نہایت قدرت کا مالک ہے اسی طرح لامحدود اختیارات سے سرفراز ہے، اور کوئی خارجی عامل اسے کسی عمل کے لئے زبردستی یا اس سے قدرت کو چھین لینے کی طاقت نہیں رکھتا اس لئے کہ ہر موجود کی قدرت اور اس کا وجود خود اسی کا مرہون منت ہے، لہٰذا وہ کبھی بھی اس طاقت کے مقابلہ میں مغلوب نہیں ہوسکتا کہ جسے اس نے دوسروں کو عطا کیا ہے.

خلاصہ

۱. صفات ذاتیہ سے مراد وہ الٰہی صفات ہیں جنہیں خدا کی ذات سے نسبت دی جاتی ہے، جیسے حیات، علم، قدرت.

۲. ایسے مفاہیم جو عبد اور معبود کے درمیان رابطہ سے حاصل ہوں انہیں صفات فعلیہ کہتے ہیں.

۳. جس طرح امتداد، کسی شی کی جسمانیت کا لازمہ ہے، حیات بھی وجود مجرد (غیر جسمانی) کا لازمہ ہے.

۴. قدرت یعنی فاعل مختار کا ہر اس امر کو انجام دینے کا ارادہ کرنا کہ جس کا اس سے صادر ہونا ممکن ہو.

۵. جو امر قدرت سے متعلق ہوگا اس میں تحقق کے امکان کا ہونا ضروری ہے.

۶. ہر کام کے انجام دینے کی قدرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان سب کو انجام دے بلکہ وہ جسے چاہے گا انجام دے گا اور جسے چاہے گا انجام نہیں دے گا.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

بارہواں سبق

صفات فعلیہ

بیچلر B.A

تمہید

صفات فعلیہ یعنی وہ مفاہیم جو ذات الٰہی اور اسکی مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ جن میں طرفین خالق و مخلوق ہیں. صفات فعلیہ کو حاصل کرنے کے لیے خالق و مخلوق کے درمیان تقابل اور خالق و مخلوق کے درمیان موجودہ رابطہ کا لحاظ کیا جاتا ہے. ہم اس سبق میں اس بحث کی تفصیل پیش کریں گے.

تفصیل

ذات باری تعالی جن صفات سے متصف ہے ان میں سے بعض صفات ایسی ہیں جنھیں خدا کی ذات سے نسبت دی جاتی ہے اور یہ وہ صفات ہیں جو ات احدیت میں پائے جانے والے کمالات سے حاصل ہوتی ہیں. علم کلام کی اصطلاح میں انہیں صفات ذاتیہ کہتے ہیں. جیسے حیات، علم، قدرت اور ... اس کے مقابلے میں کچھ صفات ایسی ہیں جو ذات احدیت اور اسکی مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کی وجہ سے ذات خدا پر اطلاق ہوتی ہیں جیسا کہ خلق کرنے کا مفہوم. یہ مفہوم، مخلوقات کے خداوند متعال سے وابستہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے. یہی وجہ ہے کہ اس رابطے کا لحاظ کیے بغیر یہ مفہوم متحقق نہیں ہوتا اور ذات احدیت کو صفت خالقیت سے متصف نہیں کیا جاسکتا. البتہ خالق و مخلوق کے درمیان پایا جانے والا یہ رابطہ محصور اور محدود نہیں ہے.

صفات فعلیہ حاصل کرنے کے لئے خالق و مخلوق کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کا لحاظ کرنا ضروری ہے، تاکہ ان روابط کے ذریعہ ایک مستقل مفہوم متحقق ہو. صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کہ درمیان بنیادی فرق اسی امر میں ہے.

بحث کو مکمل کرنے کے لئے، صفات فعلیہ میں سے اہم ترین صفات کا ذکر کرتے ہیں. خدا کی صفات فعلیہ میں سے پہلی اہم ترین صفت خالقیت ہے.

خالقیت:

گزشتہ دروس میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام ممکنات اپنی ہستی میں ذات واجب الوجود کے محتاج ہیں. اور اس لحاظ سے واجب الوجود یعنی ذات احدیت اور ممکن الوجود یعنی دوسری تمام مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے ربط کی وجہ سے واجب الوجود کے لئے خالقیت اور ممکن الوجود کے لئے مخلوقیت کا مفہوم حاصل ہو.

البتہ اس مقام پر یہ واضح رہے کہ خدا کا خلق کرنا مختلف چیزوں میں انسانوں کے تصرف اور انہیں بنانے کی مانند نہیں ہے یعنی جس طرح انسان کو حرکت اور بدن کے اعضاء کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، جس میں حرکت کو فعل اور منظر عام پر آنے والی ایجاد اور مصنوع کو نتیجہ فعل کہتے ہیں. بلکہ ذات احدیت جب کسی شئی کی تخلیق کا ارادہ کرے تو وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے. کیونکہ ذات احدیت موجودات جسمانی کے خواص سے منزہ ہے.

ربوبیت:

جس طرح تمام مخلوقات اپنے وجود اور ہستی میں ذات احدیت کی محتاج ہیں، بالکل اسی طرح اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اسی ذات کے محتاج ہیں. اور وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مخلوقات کے امور میں تصرف اور انکے امور کی تدبیر انجام دیتا ہے. جب مکمل طور پر اس رابطے اور احتیاج کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس سے مفہوم ربوبیت خود بخود اخذ ہوتا ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ مخلوقات کے تمام امور کی تدبیر بھی ذات باری تعالی کے ید قدرت میں ہے.

ربوبیت کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ربوبیت تکوینی، ربوبیت تشریعی.

ربوبیت تکوینی: یعنی موجودات عالم کی ضروریات کو پورا کرنا، ان کی دیکھ بھال کرنا. یعنی اللہ تعالی پورے جہان کا چلانے والا اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا.

ربوبیت تشریعی: انسانیت کی ہدایت کے لئے انبیاء بھیجنا. کتابیں نازل کرنا اور با شعور و مختار موجودات کے لئے وظائف و فرائض اور احکام کا معین کرنا. یہ تمام امور صرف اور صرف اللہ تعالی کی ذات احدیت کے افعال میں سے ہیں.

الوہیت:

الہ اور الوہیت کے مفہوم میں صاحبان نظر کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے. لیکن لفظ "الہ" کی بہترین اور عمدہ تفسیر جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ لفظ "الہ" کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جو عبادت اور اطاعت کے لائق ہو.

اس معنی کے لحاظ سے الوہیت ایک ایسی صفت ہے جس میں اطاعت اور عبادت کا لحاظ ہی کیا جائے گا. اور وہی ذات الہ قرار پائے گی جو اطاعت اور عبادت کے لئے شائستہ اور سزاوار ہو.

یہ ایک اعتقادی حصار ہے جس کا ماننا ہر شخص کے لئے لازم اور ضروری ہے یعنی خدا تو واجب الوجود، خلق اور صاحب اختیار ماننے کے علاوہ اسے عبادت اور اطاعت کے لائق سمجھنا بھی ضرور ہے. یہی وجہ ہے کہ اس مفہوم کو اسلام کا شعار مانا گیا ہے.

خلاصہ

۱. تمام مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کی وجہ سے واجب الوجود کے لیے خالقیت اور ممکن الوجود کے لیے مخلوقیت کا مفہوم حاصل ہوتا ہے.
۲. خدا کا خلق کرنا مختلف چیزوں میں انسانوں کے تصرف اور انہیں بنانے کی مانند نہیں ہے.
۳. ذات احدیت جب کسی شیء کی تخلیق کا ارادہ کرے تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہے.
۴. تمام مخلوقات اپنے وجود اور ہستی میں ذات احدیت کی محتاج ہیں.
۵. مخلوقات کے امور کی تمام تدبیر بھی ذات باری تعالی کے ید قدرت میں ہے.
۶. ربوبیت کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ربوبیت تکوینی، ربوبیت تشریعی.
۷. الہ، ایسی ذات جو عبادت اور اطاعت کے لائق ہو.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چودھواں سبق

توحید کے مراتب

بیچلر B.A

تمہید

توحید تمام اوصاف الٰہیہ کی شناخت کا بنیادی مسئلہ ہے، کیونکہ اسکی یکتائی اس کے لامحدود ہونے پر دلالت کرتی ہے. وجود خدا تمام کمالات کا مجموعہ ہے. ہر طرح کے عیب سے پاک و منزہ ہے اس سبق میں توحید اور اسکے مراتب بیان کیے جائیں گے اور اس کے بعد توحید افعالی کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں بحث کی جائے گی.

تفصیل

گزشتہ درس میں بیان کیا ہے کہ خدا کی صفات میں سے ایک اہم صفت، صفت الوہیت ہے. یعنی ذات باری تعالی کے علاوہ کسی کو بھی عبادت کے لائق نہ سمجھا جائے. دراصل حقیقت "لا اله الا الله" بھی یہی ہے، جسے اسلام کا شعار اور نعرہ تسلیم کیا گیا ہے. توحید کی حقیقت یہی ہے جس کے لئے کتابیں نازل ہوئیں اور انبیاء بھیجے گئے اور تمام الٰہی نمائندوں نے پرچمدار بن کر انسانیت کی حق و حقیقت کی طرف رہنمائی کی.

لہٰذا اس مقام پر ضروری ہے کہ توحید کے معانی اور اس کے مراتب کو بیان کیا جائے.

توحید کا لغوی معنی، لغوی اعتبار سے لفظ توحید (یگانہ و یکتا) کے معنی میں آتا ہے. توحید کا اصطلاحی معنی، پوری کائنات کے خالق، مالک اور مدبر کو واحد اور یکتا تسلیم کرنا، اصطلاحی طور پر توحید کہلاتا ہے.

البتہ فلاسفہ، متکلمین علمائے اخلاق اور عرفاء نے مختلف جہات سے متعدد معانی ذکر کئے ہیں جن میں سے ہر ایک معنی توحید پر دلالت کرتا ہے. جن سے اقسام توحید یا مراتب توحید جنم لیتے ہیں.

لہٰذا ہم یہاں پر توحید کے مراتب کو ذکر کرتے ہیں. ۱. توحید ذاتی، ۲. توحید صفاتی، ۳. توحید افعالی.

توحید ذاتی

توحید ذاتی سے مراد یہ ہے کہ اس پوری کائنات کو ایک ہی ذات نے پیدا کیا ہے. جبکہ اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے. دوسری الفاظ میں، اس وسیع کائنات میں پائے جانے والے تمام موجودات اور مخلوقات کو ایک ہی خالق نے بالواسطہ یا بلاواسطہ وجود بخشا ہے. یعنی بعض چیزوں کو خالق مطلق نے واسطہ کے بغیر پیدا کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض چیزیں چند واسطوں کے ذریعے خدا کی مخلوق ہوں.

جیسا کہ خالق مطلق الف، نامی اپنی ایک مخلوق کو پیدا کرے، پھر یہی الف، جو کہ خود ایک مخلوق اور اپنے وجود ذات باری تعالی کی محتاج ہے، ب کو وجود میں لائے، اسی طرح ب، ج کو وجود میں لائے. آپ نے دیکھا اس فرضیہ میں الف، کسی واسطہ بغیر خدا کی مخلوق ہے، جبکہ ب، ایک واسطہ اور ج، دو واسطوں کے ساتھ خدا کی مخلوق ہے. واضح رہے کہ اس قسم کے فرضیہ کو قبول کرنا توحید ذاتی کے ساتھ منافات رکھتا.

قرآن مجید میں توحید ذاتی کے سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے "**قل اللہ خالق کل شئ**" کہہ دو کہ "اللہ تعالی ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے".

توحید صفاتی

توحید توحید صفاتی سے مراد یہ ہے کہ ذات باری تعالی کی صفات ذاتیہ، اس کی عین ذات ہیں. جو عالم، قادر، اور حی بھی ہے یعنی ذات احدیت ایک ہی ذات ہے.

حقیقت میں توحید صفاتی دو چیزوں سے مرکب ہے.

۱. ایک یہ کہ خدا کی صفات ذاتیہ اس کی عین ذات ہیں.

۲. دوسرا یہ کہ یہ صفات خدا کی ذات میں تعدد، ترکیب اور کثرت کا موجب نہیں بنتی ہیں.

اگرچہ یہ صفات مفہوم کے لحاظ سے مختلف اور متعدد ہیں، لیکن مصداق اور وجود خارجی کے لحاظ سے ایک دوسرے اور ذات خدا کی عین ہیں، اور ایک حقیقت سے زیادہ نہیں ہیں. اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ خدا کی صفات اس کی عین ذات ہیں.

وہ اس لیے کہ خدا کی ذات بسیط ہے یعنی مختلف اجزاء کا مرکب نہیں ہے. اور اس کے لئے اجزاء کو فرض نہیں کر سکتے جیسا کہ صفات سلبیہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے.

توحید افعالی

توحید افعالی سے مراد یہ ہے کہ کائنات کے تمام امور ذات باری تعالی سے متعلق ہیں. تمام موجودات جس خاصیت کے بھی حامل ہوں. توحید افعالی سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کائنات میں پائی جانے والی تمام مخلوقات اپنی ذات میں ذات باری تعالی کی محتاج ہیں، اسی طرح اپنے تمام افعال اور حرکات و سکنات میں بھی مستقل نہیں ہیں، بلکہ ہر

لمحہ اور ہر آن اسی ذات سے وابستہ ہیں. اور جتنے افعال بھی ان سے صادر ہوتے ہیں، وہ ذات الٰہی کے مرہون منت ہیں. مثال کے طور پر کلیوں کا پھولوں میں تبدیل ہونا، آفتاب و مہتاب کا روشنی دینا، مشکلات کا حل ہونا، سب کا سب ذات الٰہی سے متعلق ہے، کیونکہ اس دنیا میں مستقل اور مؤثر صرف ذات خداوندی ہے. اور وہی ذات ہے جو فاعلیت اور تاثیر میں یکتا ہے البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخلوقات کا اپنے افعال میں کوئی کردار نہیں ہے اور جتنے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں اس میں وہ مجبور ہیں. کیونکہ مخلوقات کے اپنے افعال میں مجبور ہونے اور خدا کی تایید و نصرت اور مدد کے ساتھ افعال کے انجام دینے میں بڑا فرق ہے.
کیونکہ انسان فاعل مختار ہے اور وہ تمام کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے.

توحید افعالی کے انسان کی زندگی پر اثرات

توحید افعالی یعنی اس دنیا میں صرف اور صرف ذات باری تعالی کو مستقل اور مؤثر سمجھنا، انسان کی زندگی پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے.
۱ .اس عقیدہ کے سائے میں انسان کسی کو بھی خدا کا ہمسر قرار نہیں دیتا اور صرف اسی ذات کو لائق عبادت اور پرستش سمجھتے ہوئے اسی کے سامنے سر بسجود ہوتا ہے. اور اس کے تمام احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے.
جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے: "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ" [1] حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے اور اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے اور یہی مستحکم اور سیدھا دین ہے.
اس عقیدے کے سائے میں انسان اپنی زندگی کے تمام امور میں خدا پر توکل کرتا ہے اور صرف اسی کو اپنا مددگار سمجھتا ہے اور ہمیشہ اسی ذات کے ساتھ ہی امیدوار رہتا ہے. جس کے نتیجے میں نہ کسی سے ڈرتا ہے اور نہ ہی مادی اسباب کے کم ہونے کی صورت میں مایوس ہوتا ہے.
الغرض زندگی کے تمام معاملات میں اس کا بھروسہ ذات باری تعالی پر ہوتا ہے اور اسی کی عظمت اس کے مد نظر رہتی ہے. ایسے شخص کے بارے میں خدا قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: "وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ

[1]. یوسف/۴۰

مَخْرَجًا*وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا "[1]

اور جو اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے☆اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ سوچ بھی نہ سکتا ہو اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے پس اس کے لیے اللہ کافی ہے، اللہ اپنا حکم پورا کرنے والا ہے، بتحقیق اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔

اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے. اور جو خدا پر بھروسہ کرے گا خدا اس کے لئے کافی ہے. بے شک خدا اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے. اس نے ہر شئی کے لئے ایک مقدار معین کر دی ہے.

خلاصہ

۱. خدا کمال مطلق ہے. اس کے لئے کوئی حد اور مقدار نہیں.
۲. وحدانیت خدا پر تمام انبیاء کی خبریں اس کی وحدانیت پر ٹھوس دلیل ہیں.
۳. توحید کے چار مراتب ہیں توحید ذاتی، صفاتی، افعالی، توحید در عبادت.
۴. خدا کی ذات ہر جہت سے بے نظیر ہے، اسکی مانند کوئی شئی نہیں. وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے.
۵. دونوں عالم کے تمام امور فعل خداوند سے متعلق ہیں.
۶. توحید افعالی کے عقیدہ کی وجہ سے انسان اپنی زندگی کے تمام امور میں خدا پر توکل کرتا ہے اور صرف اسی کو اپنا مددگار سمجھتا ہے اور ہمیشہ اسی ذات سے ہی امیدوار رہتا ہے.

[1]. طلاق/۳،۲

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

سولہواں سبق

توحید عبادی

بیچلر B.A

تمہید

توحید کی قسموں میں اہم ترین قسم توحید در عبادت ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں۔ احترام، تواضع اور خشوع کے مراتب اور درجات ہیں اور سب سے آخری اور اعلی درجہ پرستش و عبودیت ہے۔ اور یہ مرحلہ صرف ذات خداوند متعال سے مخصوص ہے۔ جس کا بین ثبوت سجدہ ہے۔ کمال مطلق کی جانب پیش قدمی گناہوں اور تمام آلودگیوں سے کنارہ کشی کا پیش خیمہ ہے۔ اس سبق میں توحید عبادی کی بحث کو قرآن مجید کی آیات کے ساتھ بیان کریں گے۔

تفصیل

گزشتہ درس میں ہم نے مراتب توحید کے عنوان سے توحید کی تین قسمیں توحید ذاتی، توحید صفاتی اور توحید افعالی کو ذکر کیا ہے۔ علمی اصطلاح میں توحید کی ان تینوں قسموں کو توحید نظری کے باب سے شمار کیا جاتا ہے۔ آج کے درس میں ہم توحید کی ایک اور قسم بیان کرتے ہیں جسے "عبادت میں توحید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور علمی اصطلاح میں اسے توحید عملی کہتے ہیں۔ کہ جس کے بہت سے افراد اور مصادیق ہیں۔ جن میں سے ایک اہم مصداق عبادت میں توحید ہے۔

البتہ توحید در عبادت کی وضاحت سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ خدا کی شناخت و معرفت اور ذات باری تعالی کے پورے عالم اور بالخصوص انسان کے ستھ رابطے کے بارے میں راسخ اعتقادات اور نظریات کے مجموعے کو توحید نظری کہتے ہیں۔ مثلاً وہ انسان جو مکتب توحیدی اسلام میں تربیت پاتا ہے وہ خدا کی وحدانیت، خالقیت، ربوبیت اور الوہیت کا اعتقاد رکھتا ہے یعنی صرف اسی ذات کو خالق، رب اور الہ سمجھتا ہے۔ کسی انسان کا ذات باری تعالی کے بارے میں اس قسم کے صحیح اور درست اعتقادات کو توحید نظری کہتے ہیں۔

دوسری طرف یہ اعتقادات اور نظریات انسان کی عملی زندگی میں مؤثر واقع ہوتے ہیں، اور انسان کے اعمال میں توحیدی رنگ پایا جاتا ہے کہ جسے توحید عملی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسی توحید عملی کے اہم ترین جلووں سے ایک جلوہ توحید عبادی ہے۔ کہ جس کی یہاں پر وضاحت ضروری ہے۔

توحید عبادی: ذات باری تعالی کے علاوہ کسی کو بھی عبادت اور بندگی کے لائق نہ سمجھنا، توحید عبادی کہلاتا ہے۔ توحید کی یہ قسم توحید ذاتی اور توحید صفاتی کا لازمہ ہے۔ کیونکہ جب یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ ذات واجب الوجود ہے

اور کائنات کی ہر چیز اپنے وجود اور بقاء میں اسی کی محتاج ہے اور وہ کمال مطلق ہے تو عبادت اور بندگی بھی اسی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور وہی لائق عبادت ہے. یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء اور مرسلین کی تبلیغ کا کلی عنوان توحید عبادی تھا.

قرآن مجید میں بھی بہت سارے مقامات پر توحید کی اس قسم پر زور دیا گیا ہے. جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے. "وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ" [1] اور بتحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو.

دوسرے مقام پر ارشاد خداوندی ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ" [2] اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے، بتحقیق میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم صرف میری عبادت کرو۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ" [3] بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہٰذا تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے.

اس مقام پر ایک مطلب کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ احترام، تواضع اور خشوع کے مراتب و درجات ہیں. اور سب سے آخری اور اعلیٰ درجہ پرستش اور عبادت اور سجدہ ہے جو ذات ربوبی کے ساتھ مخصوص ہے.

اسی بنا پر غیر خدا کا سجدہ حرام اور شرک کے زمرہ میں آتا ہے.

---

[1]. نحل/۳۶

[2]. انبیاء/۲۵

[3]. آل عمران/۵۱

خلاصہ

۱. ہر وہ انسان جو مکتب توحید اسلام میں تربیت پاتا ہے وہ خدا کی وحدانیت، خالقیت، ربوبیت اور الوہیت کا اعتقاد رکھتا ہے.

۲. ذات باری تعالی کے علاوہ کسی کو بھی عبادت اور بندگی کے لائق نہ سمجھنا توحید عبادی کہلاتا ہے.

۳. خدا کی ذات واجب الوجود ہے اور کائنات کی ہر چیز اپنے وجود اور بقاء میں اسی کی محتاج ہے اور وہ کمال مطلق ہے.

۴. تمام انبیاء اور مرسلین کی تبلیغ کا کلی عنوان توحید عبادی تھا.

۵. عبادت اور بندگی صرف خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے.

۶. غیر خدا کا سجدہ حرام اور شرک کے زمرہ میں آتا ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

سترہواں سبق

شفاعت

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد اور اصولوں میں سے ایک عقیدہ شفاعت ہے . اس عقیدہ کے بارے میں متعدد آیات مبارکہ میں واضح بیان آیا ہے . اسی طرح قرآن نے ہی شفاعت کے اصول بھی بیان کیے ہیں . ہم اس سبق میں سب سے پہلے شفاعت کے مفہوم کی وضاحت کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ شفاعت کا معیار کیا ہے اور کن اصولوں کے تحت شفاعت کسی بھی شخص کے شامل ہو سکتی ہے اور آخر میں شفاعت سے متعلق آیات میں جو ظاہری تضاد دکھائی دیتا ہے اسے بھی حل کرتے ہوئے اس عنوان پر سیر حاصل بحث کی جائے گی . س

تفصیل

من جملہ ان خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت کہ جس کو خداوند عالم نے مومنین سے مخصوص کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مومن شخص مرتے دم تک اپنے ایمان کی حفاظت کرلے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، جو اس کی توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث بنیں اور اس کی عاقبت کی بد بختی شک و شبہ یا انکار و جحود کی منزل تک پہنچادے، اور ایک جملہ میں یوں خلاصہ کر دیا جائے کہ اگر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے اٹھے تو وہ ہر گز ابدی عذاب میں مبتلا نہیں ہو گا اس لئے کہ اس کے چھوٹے گناہ، بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے کی وجہ سے بخش دیے جائیں گے، اور اُس کے بڑے گناہ توبہ و استغفار کے وسیلہ سے معاف کر دیے جائیں گے، اور اگر اُسے ایسی توبہ کی توفیق حاصل نہ ہو سکی، تو دنیا کی مصیبتیں اور پریشانیاں اُس کے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیں گی نیز برزخ اور قیامت کی ابتدائی سختیاں اس کے اعمال کے نقائص اور آلودگیوں کو دور کر دیں گی اور اگر اس کے باوجود اسکے گناہوں کی آلودگی پاک نہ ہو سکی تو شفاعت کے وسیلہ سے جو اولیاء خدا خصوصاً حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ اور ان کے اہل بیت علیہم السلام جو خدا کی وسیع و عظیم رحمت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں، کے ذریعہ جہنم کے عذاب سے نجات پا جائیں گے[1]

کئی روایات کی روشنی میں وہ مقام محمود[2] جس کا وعدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا ہے وہ اسی مقام شفاعت کا نام ہے اور خود یہ آیہ شریفہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ[3] اور تمھارا پروردگار تمھیں اتنا عطا کر دے گا

---

[1]. اذخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) میں نے اپنی شفاعت اپنے امت کے گنہگاروں کے لئے ذخیرہ کیا ہے، بحار لانوار / ج ۸ ص ۳۷ . ۴۰.

[2]. اسراء / ۷۹،

[3]. ضحیٰ / ۵

کہ تم خوش ہو جاؤگے حضور کی شفاعت کے ذریعہ الٰہی بخشش کی طرف اشارہ ہے جو مستحق افراد کے شامل حال ہو گی.

اس بناپر گنہگار مومنین کی سب سے بڑی اور آخری امید اور آسرا شفاعت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے عذاب سے امان کا یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیشہ یہ خوف دل میں جاگتا رہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا فعل سر زد ہو جائے جو مرتے دم تک کبھی بھی اس کی عاقبت کی بربادی یا ایمان کے سلب ہو جانے کا سبب بن جائے ،اور خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں اس حد تک رسوخ کر جائے کہ (معاذاللہ) وہ اللہ کی دشمنی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں . اس لئے وہ لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ہے جو ان کے اور ان کی محبوب اور معشوق اشیاء کے درمیان موت کے ذریعہ جدائی ڈال دیتا ہے .

شفاعت کا مفہوم

شفاعت ،مادہ شفع سے لیا گیا ہے جو جوڑے کے معنی میں ہے اور عرف عام میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گذار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے اور شاید ایسے مقامات پر لفظ شفاعت کو استعمال کرنے کا نکتہ یہ ہو کہ مجرم انسان خود بخود بخشے جانے کا مستحق نہیں ہوتا، یا خدمت کار خود بخود اجرت میں اضافہ کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن سفارش کرنے والے (شفیع) کی درخواست کا منسلک ہو جانا اسے اس کا مستحق بنا دیتا ہے عام حالات میں کوئی کسی سفارش کرنے والے کی سفارش کو اس لئے قبول کر لیتا ہے کہ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی سفارش کو قبول نہ کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کا رنجیدہ خاطر ہونا اس کی الفت یا خدمت کی لذت سے محرومی کا سبب بنے گا، یا ممکن ہے کہ سفارش کرنے والے کی جانب سے نقصان پہنچنے کا باعث ہو. وہ مشرکین جو اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کے لئے انسانی اوصاف کے قائل تھے، جیسے شریک حیات ، مونس و مددگار دوست ،ہم مشغلہ ساتھی کی محبت کی ضرورت یا اپنے رقیب اور اپنے برابر کی شخصیت سے خوف وغیرہ، وہ خدا کے لئے ان سب صفات کے اس لئے قائل تھے، کہ ان کی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کے غضب سے محفوظ رہیں، اور اسی لئے وہ لوگ بتوں اور مجسموں کے مقابلہ میں فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے. هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِندَ

اللّٰہِ [۱] یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں اور کہتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ [۲] ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنادیں.

اور قرآن مجید ان لوگوں کے جاہلانہ خیالات کو اس طرح باطل کرتے ہوئے فرماتا ہے: لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ [۳] اللہ کے سوا اس کا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ ہی شفاعت کنندہ.

لیکن غور و فکر کا مقام ہے کہ ایسے شفاعت کرنے والوں اور ایسی شفاعت کی نفی کرنے کے معنی مطلقاً شفاعت کا انکار کرنا نہیں ہے، خود قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جو شفاعت کو (خدا کی اجازت اور اس کے اذن سے ثابت کرتی ہیں)

(شفاعت باذن اللہ) اور وہ آیات شفاعت کرنے والوں اور جنکی شفاعت کی جائے گی ان کی شرائط کو بھی بیان کر رہی ہیں اور خدا کی جانب سے اجازت یافتہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا، کسی خوف یا ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے خداوند عالم نے ان لوگوں کے لئے کھولا ہے، جن کے اندر رحمت الٰہی، کی لیاقت کم پائی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ شرطیں اور اصول قرار دیئے ہیں. درحقیقت صحیح شفاعت پر عقیدہ، اور شرک آمیز شفاعت پر عقیدہ کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق، خدا کی جانب سے حاکمیت اور تدبیر، اور خود مختار حاکمیت وتدبیر کے درمیان ہے. یہ بحث خداشناسی کے باب میں بیان ہو چکی ہے. [۴] کبھی کبھی شفاعت کا لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے کے ذریعہ اچھا اثر ظاہر ہونے کو بھی شامل ہے جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یا اس کے برعکس، اسی طرح معلم اور رہنما اپنے شاگردوں کے متعلق اور یہاں تک کہ موذن ان لوگوں کے متعلق جو اس کی آواز کو سن کر نماز کو یاد کرتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شفاعت کریں گے اور درحقیقت ہر نیک کام جو اس دنیا میں انجام دیا گیا ہے وہ شفاعت اور مدد کی شکل قیامت کے دن ظاہر ہوگا.

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ گنہگاروں کی توبہ واستغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور یہاں تک کہ دوسروں کے حق میں دعا کرنا اور خدا سے ان کی حاجتوں کو پورا ہونے کی درخواست کرنا درحقیقت خدا کے

---

[۱]. یونس/۱۸

[۲]. زمر/۳

[۳]. انعام/۷۰

[۴]. رجوع کریں، باب خداشناسی درس نمبر ۱۶.

نزدیک شفاعت شمار کی جاتی ہے، کیونکہ یہ ساری چیزیں خدا کے نزدیک کسی انسان تک نیکی پہنچانے یا کسی سے شرک کو دور کرنے کے ذریعہ ہے.

شفاعت کے اصول

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کرنے یا شفاعت پانے کے لئے بنیادی شرط خدا کی اجازت ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵، میں ارشاد ہوا ہے'' مَن ذَالَّذِی یَشفَعُ عِندَہُ اِلَّا بِاِذنِہِ '' کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے ،اور سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ میں یوں ارشاد ہے : ''مَا مِن شَفِیعٍ اِلَّا مِن بَعدِ اِذنِہِ '' کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد اور سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں بھی ارشاد ہو رہا ہے : یَومَئِذٍ لَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ الرَّحمٰنُ وَ رَضِیَ لَہُ قَولاً اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی، سوائے ان کے جنھیں خدا نے اجازت دیدی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو اور سورہ سباء کی آیت نمبر ۲۳ میں فرماتا ہے: وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِندَہُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ . اس کے نزدیک کسی کی سفارش کام نہ آئے گی مگر اس کی جس کو اجازت دے دی گئی ہو.

ان آیات سے اجمالی طور سے خدا کی اجازت ثابت ہوتی ہے لیکن اجازت یافتہ افراد کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا.

سبق نمبر ۱۹

لیکن دوسری آیات کے ذریعہ طرفین (شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے) کی شرطوں کو واضح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے:

وَلا یَملِکُ الَّذِینَ یَدعُونَ مِن دُونِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَن شَھِدَ بِالحَقِّ وَ ھُم یَعلَمُونَ اور وہ لوگ جو خدا کے علاوہ کسی اور کو آواز دیتے ہیں شفاعت کا حق نہیں رکھتے (اور کسی کو بھی شفاعت کا حق نہیں) مگر وہ جو حق کی گواہی دے اور علم بھی رکھتا ہو، شاید مَن شَھِدَ بِالحَق سے مراد اعمال کے اوپر گواہ فرشتے ہوں جو خدا کی تعلیم کے ذریعہ بندوں کے اعمال اور نیتوں سے واقف رہتے ہیں اور ان کی رفتار و کردار کی قدر و قیمت اور کیفیت پر شہا

دت دے سکتے ہیں، جیساکہ حکم اور موضوع کے تناسب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ سفارش کرنے والوں کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ جو شفاعت پانے والوں کی صلاحیت کی تشخیص دے سکیں.

اور یقینی طور سے ان دونوں شرائط کے حامل وہ معصومین علیہم السلام ہیں، دوسری طرف سے بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت پانے والے مرضی خدا کے حق دار ہوں گے جیساکہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہے: وَلَا يَشفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارتَضىٰ سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے اور سورہ نجم کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے: وَكَم مِن مَلَكٍ فِي السَّموات لَا تُغنِي شَفَاعَتُهُم شَيئًا اِلَّا مِن بَعدِ اَن يَأذَنَ اللّٰهُ لِمَن يَشَاء وَيَرضىٰ اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کام نہیں آسکتی، جب تک خداوند متعال جس کے بارے میں چاہے اور پسند کرے اجازت نہ دیدے.

مذکورہ مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین وایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو جیساکہ روایات میں اسی عنوان سے تفسیر ہوئی ہے.

دوسری طرف چند آیتوں میں ان لوگوں کی خصلت جن کی سفارش نہیں ہو سکتی بیان کی گئی ہے، جیسے سورہ شعراء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مشرکین کے قول کو نقل کر رہا ہے فَمَا لَنَا مِن شَافِعِين اور سورہ مدثر کی آیت نمبر ۴۰/ سے ۴۸/ تک آیا ہے کہ مجرموں کے دوزخ میں جانے کے سبب کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ لوگ جواب میں ترکِ نماز[1] بیکسوں کی مدد نہ کرنے روز قیامت کے جھٹلانے کی خصلت کو گنوائیں گے. اس کے بعد ارشاد ہے فَمَا تَنفَعُهُم شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ مشرکین اور قیامت کا انکار کرنے والے جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس کے محتاج بندوں کی مدد نہیں کرتے، اور وہ صحیح اصولوں اور قوانین کے پابند نہیں ہیں شفاعت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی اور اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استغفار کرنا بھی اس دنیا میں ایک طرح کی شفاعت ہے اور ان کا استغفار کرنا ان لوگوں کے حق میں جو اس بات کے لئے حاضر نہیں ہیں، آپ سے استغفار و شفاعت کی درخواست کریں شامل نہیں ہوگا[2]

[1]. امام صادق (ع) اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا: (انّ شفاعتنا لا تنال من استخف بالصلوٰۃ) ہماری شفاعت اس انسان تک نہیں پہنچ سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے. بحار الانوار/ ج ۴ ص ۲

[2]. منافقون/ ۶، ۵

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفاعت کا انکار کرنے والا بھی شفاعت کا حق دار نہیں ہے جیسا کہ یہی مضمون احادیث میں ذکر ہوا ہے.[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ مطلّقا سفارش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی اجازت کے علاوہ خود بھی معصیت کار نہ ہو اور دوسروں کے گناہ اور اطاعت کے مراتب کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو نیز سچے پیروکار بھی ان کے زیر سا یہ شفاعت کے کمترین مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں، جیسا کہ ایسے افراد شہداء اور صدیقین کے زمرہ میں محشور کئے جا ئیں گے[2] اور دوسری طرف صرف وہ لوگ شفاعت پانے کا حق رکھتے ہیں جو خدا کی اجازت کے علاوہ خدا و رسول اور قیامت اور وہ چیزیں جو خدا نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی ہیں جیسے شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھنا، نیز اس اعتقاد پر آخر دم تک باقی رہنا ہے.

خلاصہ

۱. عرف عام میں شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گزار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے.

۲. شفاعت وہ لوگ کر سکیں گے جنھیں خدا کی طرف سے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی ہے.

۳. گنہکاروں کی توبہ و استغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور دوسروں کے حق میں دعا کرنا بھی شفاعت ہے.

۴. رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین و ایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو.

۵. تارک نماز، بے کسوں کی مدد نہ کرنے والا، روز قیامت کو جھٹلانے والا، خدا کی عبادت نہ کرنے والا اور شفاعت کے انکار کرنے والے، شفاعت کے حقدار نہیں ہیں.

---

[1]. (عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَن لم یؤمن بشفاعتی فلا انالہ اللہ شفاعتی) جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا میری شفاعت کو اس کے شامل حال نہیں کرے گا، بحار لانوار ج۸ ص ۵۸،

[2]. والذین آمنوا باللہ ورسولہ اولئک ھم الصدقون والشداء عند ربھم (جو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے خدا کے نزدیک وہی لوگ صدیقین اور شہداء ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

اٹھارہواں سبق

شفاعت

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد اور اصولوں میں سے ایک عقیدہ شفاعت ہے . اس عقیدہ کے بارے میں متعدد آیات مبارکہ میں واضح بیان آیا ہے . اسی طرح قرآن نے ہی شفاعت کے اصول بھی بیان کیے ہیں . ہم اس سبق میں سب سے پہلے شفاعت کے مفہوم کی وضاحت کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ شفاعت کا معیار کیا ہے اور کن اصولوں کے تحت شفاعت کسی بھی شخص کے شامل ہو سکتی ہے اور آخر میں شفاعت سے متعلق آیات میں جو ظاہری تضاد دکھائی دیتا ہے اسے بھی حل کرتے ہوئے اس عنوان پر سیر حاصل بحث کی جائے گی . س

تفصیل

من جملہ ان خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت کہ جس کو خداوند عالم نے مومنین سے مخصوص کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مومن شخص مرتے دم تک اپنے ایمان کی حفاظت کرلے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، جو اس کی توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث بنیں اور اس کی عاقبت کی بد بختی شک و شبہ یا انکار و جحود کی منزل تک پہنچادے، اور ایک جملہ میں یوں خلاصہ کر دیا جائے کہ اگر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے اٹھے تو وہ ہر گز ابدی عذاب میں مبتلا نہیں ہو گا اس لئے کہ اس کے چھوٹے گناہ، بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے کی وجہ سے بخش دیے جائیں گے، اور اُس کے بڑے گناہ توبہ و استغفار کے وسیلہ سے معاف کر دیے جائیں گے، اور اگر اُسے ایسی توبہ کی توفیق حاصل نہ ہو سکی، تو دنیا کی مصیبتیں اور پریشانیاں اُس کے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیں گی نیز برزخ اور قیامت کی ابتدائی سختیاں اس کے اعمال کے نقائص اور آلودگیوں کو دور کر دیں گی اور اگر اس کے باوجود اسکے گناہوں کی آلودگی پاک نہ ہو سکی تو شفاعت کے وسیلہ سے جو اولیاء خدا خصوصاً حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ اور ان کے اہل بیت علیہم السلام جو خدا کی وسیع و عظیم رحمت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں، کے ذریعہ جہنم کے عذاب سے نجات پا جائیں گے[1]

کئی روایات کی روشنی میں وہ مقام محمود[2] جس کا وعدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا ہے وہ اسی مقام شفاعت کا نام ہے اور خود یہ آیہ شریفہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ[3] اور تمھارا پروردگار تمھیں اتنا عطا کر دے گا

---

[1]. اذخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) میں نے اپنی شفاعت اپنے امت کے گنہگاروں کے لئے ذخیرہ کیا ہے، بحار لانوار / ج ۸ ص ۳۷ . ۴۰.

[2]. اسراء / ۷۹،

[3]. ضحیٰ / ۵

کہ تم خوش ہو جاؤگے حضور کی شفاعت کے ذریعہ الٰہی بخشش کی طرف اشارہ ہے جو مستحق افراد کے شامل حال ہو گی.

اس بناپر گنہگار مومنین کی سب سے بڑی اور آخری امید اور آسرا شفاعت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے عذاب سے امان کا یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیشہ یہ خوف دل میں جاگتا رہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا فعل سر زد ہو جائے جو مرتے دم تک کبھی بھی اس کی عاقبت کی بربادی یا ایمان کے سلب ہو جانے کا سبب بن جائے ،اور خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں اس حد تک رسوخ کر جائے کہ (معاذاللہ) وہ اللہ کی دشمنی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں . اس لئے وہ لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ہے جو ان کے اور ان کی محبوب اور معشوق اشیاء کے درمیان موت کے ذریعہ جدائی ڈال دیتا ہے .

شفاعت کا مفہوم

شفاعت ،مادہ شفع سے لیا گیا ہے جو جوڑے کے معنی میں ہے اور عرف عام میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گذار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے اور شاید ایسے مقامات پر لفظ شفاعت کو استعمال کرنے کا نکتہ یہ ہو کہ مجرم انسان خود بخود بخشے جانے کا مستحق نہیں ہوتا، یا خدمت کار خود بخود اجرت میں اضافہ کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن سفارش کرنے والے (شفیع) کی درخواست کا منسلک ہو جانا اسے اس کا مستحق بنا دیتا ہے عام حالات میں کوئی کسی سفارش کرنے والے کی سفارش کو اس لئے قبول کر لیتا ہے کہ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی سفارش کو قبول نہ کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کا رنجیدہ خاطر ہونا اس کی الفت یا خدمت کی لذت سے محرومی کا سبب بنے گا، یا ممکن ہے کہ سفارش کرنے والے کی جانب سے نقصان پہنچنے کا باعث ہو. وہ مشرکین جو اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کے لئے انسانی اوصاف کے قائل تھے، جیسے شریک حیات ، مونس و مددگار دوست ،ہم مشغلہ ساتھی کی محبت کی ضرورت یا اپنے رقیب اور اپنے برابر کی شخصیت سے خوف وغیرہ، وہ خدا کے لئے ان سب صفات کے اس لئے قائل تھے، کہ ان کی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کے غضب سے محفوظ رہیں، اور اسی لئے وہ لوگ بتوں اور مجسموں کے مقابلہ میں فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے. هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِندَ

اللّٰہِ [۱] یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں اور کہتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ [۲] ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنادیں.

اور قرآن مجید ان لوگوں کے جاہلانہ خیالات کو اس طرح باطل کرتے ہوئے فرماتا ہے: لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ [۳] اللہ کے سوا اس کا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ ہی شفاعت کنندہ.

لیکن غور و فکر کا مقام ہے کہ ایسے شفاعت کرنے والوں اور ایسی شفاعت کی نفی کرنے کے معنی مطلقاً شفاعت کا انکار کرنا نہیں ہے، خود قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جو شفاعت کو (خدا کی اجازت اور اس کے اذن سے ثابت کرتی ہیں)

(شفاعت باذن اللہ) اور وہ آیات شفاعت کرنے والوں اور جنکی شفاعت کی جائے گی ان کی شرائط کو بھی بیان کر رہی ہیں اور خدا کی جانب سے اجازت یافتہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا، کسی خوف یا ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے خداوند عالم نے ان لوگوں کے لئے کھولا ہے، جن کے اندر رحمت الٰہی، کی لیاقت کم پائی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ شرطیں اور اصول قرار دیئے ہیں. درحقیقت صحیح شفاعت پر عقیدہ، اور شرک آمیز شفاعت پر عقیدہ کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق، خدا کی جانب سے حاکمیت اور تدبیر، اور خود مختار حاکمیت وتدبیر کے درمیان ہے. یہ بحث خداشناسی کے باب میں بیان ہو چکی ہے. [۴] کبھی کبھی شفاعت کا لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے کے ذریعہ اچھا اثر ظاہر ہونے کو بھی شامل ہے جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یا اس کے برعکس، اسی طرح معلم اور رہنما اپنے شاگردوں کے متعلق اور یہاں تک کہ موذن ان لوگوں کے متعلق جو اس کی آواز کو سن کر نماز کو یاد کرتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شفاعت کریں گے اور درحقیقت ہر نیک کام جو اس دنیا میں انجام دیا گیا ہے وہ شفاعت اور مدد کی شکل قیامت کے دن ظاہر ہوگا.

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ گنہگاروں کی توبہ واستغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور یہاں تک کہ دوسروں کے حق میں دعا کرنا اور خدا سے ان کی حاجتوں کو پورا ہونے کی درخواست کرنا درحقیقت خدا کے

---

[۱]. یونس/۱۸

[۲]. زمر/۳

[۳]. انعام/۷۰

[۴]. رجوع کریں، باب خداشناسی درس نمبر ۱۶.

نزدیک شفاعت شمار کی جاتی ہے، کیونکہ یہ ساری چیزیں خدا کے نزدیک کسی انسان تک نیکی پہنچانے یا کسی سے شرک کو دور کرنے کے ذریعہ ہے.

شفاعت کے اصول

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کرنے یا شفاعت پانے کے لئے بنیادی شرط خدا کی اجازت ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵، میں ارشاد ہوا ہے'' مَن ذَالَّذِی یَشفَعُ عِندَہُ اِلَّا بِاِذنِہِ '' کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے ،اور سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ میں یوں ارشاد ہے : ''مَا مِن شَفِیعٍ اِلَّا مِن بَعدِ اِذنِہِ '' کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد اور سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں بھی ارشاد ہو رہا ہے : یَومَئِذٍ لَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ الرَّحمٰنُ وَ رَضِیَ لَہُ قَولاً اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی، سوائے ان کے جنھیں خدا نے اجازت دیدی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو اور سورہ سباء کی آیت نمبر ۲۳ میں فرماتا ہے: وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِندَہُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ . اس کے نزدیک کسی کی سفارش کام نہ آئے گی مگر اس کی جس کو اجازت دے دی گئی ہو.

ان آیات سے اجمالی طور سے خدا کی اجازت ثابت ہوتی ہے لیکن اجازت یافتہ افراد کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا.

سبق نمبر ۱۹

لیکن دوسری آیات کے ذریعہ طرفین (شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے) کی شرطوں کو واضح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے:

وَلا یَملِکُ الَّذِینَ یَدعُونَ مِن دُونِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَن شَھِدَ بِالحَقِّ وَ ھُم یَعلَمُونَ اور وہ لوگ جو خدا کے علاوہ کسی اور کو آواز دیتے ہیں شفاعت کا حق نہیں رکھتے (اور کسی کو بھی شفاعت کا حق نہیں) مگر وہ جو حق کی گواہی دے اور علم بھی رکھتا ہو، شاید مَن شَھِدَ بِالحَق سے مراد اعمال کے اوپر گواہ فرشتے ہوں جو خدا کی تعلیم کے ذریعہ بندوں کے اعمال اور نیتوں سے واقف رہتے ہیں اور ان کی رفتار و کردار کی قدر و قیمت اور کیفیت پر شہا

دت دے سکتے ہیں، جیساکہ حکم اور موضوع کے تناسب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ سفارش کرنے والوں کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ جو شفاعت پانے والوں کی صلاحیت کی تشخیص دے سکیں.

اور یقینی طور سے ان دونوں شرائط کے حامل وہ معصومین علیہم السلام ہیں، دوسری طرف سے بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت پانے والے مرضی خدا کے حق دار ہوں گے جیساکہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہے: وَلَا يَشفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارتَضىٰ سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے اور سورہ نجم کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے: وَكَم مِن مَلَكٍ فِي السَّموات لَا تُغنِي شَفَاعَتُهُم شَيئًا اِلَّا مِن بَعدِ اَن يَأذَنَ اللّٰهُ لِمَن يَشَاء وَيَرضىٰ اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کام نہیں آسکتی، جب تک خداوند متعال جس کے بارے میں چاہے اور پسند کرے اجازت نہ دیدے.

مذکورہ مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین وایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو جیساکہ روایات میں اسی عنوان سے تفسیر ہوئی ہے.

دوسری طرف چند آیتوں میں ان لوگوں کی خصلت جن کی سفارش نہیں ہو سکتی بیان کی گئی ہے، جیسے سورہ شعراء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مشرکین کے قول کو نقل کر رہا ہے فَمَا لَنَا مِن شَافِعِين اور سورہ مدثر کی آیت نمبر ۴۰/ سے ۴۸/ تک آیا ہے کہ مجرموں کے دوزخ میں جانے کے سبب کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ لوگ جواب میں ترکِ نماز[1] بیکسوں کی مدد نہ کرنے روز قیامت کے جھٹلانے کی خصلت کو گنوائیں گے. اس کے بعد ارشاد ہے فَمَا تَنفَعُهُم شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ مشرکین اور قیامت کا انکار کرنے والے جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس کے محتاج بندوں کی مدد نہیں کرتے، اور وہ صحیح اصولوں اور قوانین کے پابند نہیں ہیں شفاعت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی اور اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استغفار کرنا بھی اس دنیا میں ایک طرح کی شفاعت ہے اور ان کا استغفار کرنا ان لوگوں کے حق میں جو اس بات کے لئے حاضر نہیں ہیں، آپ سے استغفار و شفاعت کی درخواست کریں شامل نہیں ہوگا[2]

[1]. امام صادق (ع) اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا: (انّ شفاعتنا لا تنال من استخف بالصلوٰۃ) ہماری شفاعت اس انسان تک نہیں پہنچ سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے. بحار الانوار/ ج ۴ ص ۲

[2]. منافقون/ ۶، ۵

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفاعت کا انکار کرنے والا بھی شفاعت کا حق دار نہیں ہے جیسا کہ یہی مضمون احادیث میں ذکر ہوا ہے.[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ مطلّقا سفارش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی اجازت کے علاوہ خود بھی معصیت کار نہ ہو اور دوسروں کے گناہ اور اطاعت کے مراتب کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو نیز سچے پیروکار بھی ان کے زیر سا یہ شفاعت کے کمترین مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں، جیسا کہ ایسے افراد شہداء اور صدیقین کے زمرہ میں محشور کئے جا ئیں گے[2] اور دوسری طرف صرف وہ لوگ شفاعت پانے کا حق رکھتے ہیں جو خدا کی اجازت کے علاوہ خدا و رسول اور قیامت اور وہ چیزیں جو خدا نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی ہیں جیسے شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھنا، نیز اس اعتقاد پر آخر دم تک باقی رہنا ہے.

خلاصہ

۱. عرف عام میں شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گزار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے.

۲. شفاعت وہ لوگ کر سکیں گے جنھیں خدا کی طرف سے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی ہے.

۳. گنہکاروں کی توبہ و استغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور دوسروں کے حق میں دعا کرنا بھی شفاعت ہے.

۴. رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین و ایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو.

۵. تارک نماز، بے کسوں کی مدد نہ کرنے والا، روز قیامت کو جھٹلانے والا، خدا کی عبادت نہ کرنے والا اور شفاعت کے انکار کرنے والے، شفاعت کے حقدار نہیں ہیں.

---

[1]. (عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَن لم یؤمن بشفاعتی فلا انالہ اللہ شفاعتی) جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا میری شفاعت کو اس کے شامل حال نہیں کرے گا، بحار لانوار ج۸ ص ۵۸،

[2]. والذین آمنوا باللہ ورسولہ اولئک ھم الصدقون والشداء عند ربھم (جو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے خدا کے نزدیک وہی لوگ صدیقین اور شہداء ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

انیسواں سبق

شفاعت

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد اور اصولوں میں سے ایک عقیدہ شفاعت ہے . اس عقیدہ کے بارے میں متعدد آیات مبارکہ میں واضح بیان آیا ہے . اسی طرح قرآن نے ہی شفاعت کے اصول بھی بیان کیے ہیں . ہم اس سبق میں سب سے پہلے شفاعت کے مفہوم کی وضاحت کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ شفاعت کا معیار کیا ہے اور کن اصولوں کے تحت شفاعت کسی بھی شخص کے شامل ہو سکتی ہے اور آخر میں شفاعت سے متعلق آیات میں جو ظاہری تضاد دکھائی دیتا ہے اسے بھی حل کرتے ہوئے اس عنوان پر سیر حاصل بحث کی جائے گی . س

تفصیل

من جملہ ان خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت کہ جس کو خداوند عالم نے مومنین سے مخصوص کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مومن شخص مرتے دم تک اپنے ایمان کی حفاظت کرلے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، جو اس کی توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث بنیں اور اس کی عاقبت کی بد بختی شک و شبہ یا انکار و جحود کی منزل تک پہنچادے، اور ایک جملہ میں یوں خلاصہ کر دیا جائے کہ اگر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے اٹھے تو وہ ہر گز ابدی عذاب میں مبتلا نہیں ہو گا اس لئے کہ اس کے چھوٹے گناہ، بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے کی وجہ سے بخش دیے جائیں گے، اور اُس کے بڑے گناہ توبہ و استغفار کے وسیلہ سے معاف کر دیے جائیں گے، اور اگر اُسے ایسی توبہ کی توفیق حاصل نہ ہو سکی، تو دنیا کی مصیبتیں اور پریشانیاں اُس کے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیں گی نیز برزخ اور قیامت کی ابتدائی سختیاں اس کے اعمال کے نقائص اور آلودگیوں کو دور کر دیں گی اور اگر اس کے باوجود اسکے گناہوں کی آلودگی پاک نہ ہو سکی تو شفاعت کے وسیلہ سے جو اولیاء خدا خصوصاً حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ اور ان کے اہل بیت علیہم السلام جو خدا کی وسیع و عظیم رحمت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں، کے ذریعہ جہنم کے عذاب سے نجات پا جائیں گے[1]

کئی روایات کی روشنی میں وہ مقام محمود[2] جس کا وعدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا ہے وہ اسی مقام شفاعت کا نام ہے اور خود یہ آیہ شریفہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ[3] اور تمھارا پروردگار تمھیں اتنا عطا کر دے گا

---

[1]. اذخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) میں نے اپنی شفاعت اپنے امت کے گنہگاروں کے لئے ذخیرہ کیا ہے، بحار لانوار / ج ۸ ص ۳۷ . ۴۰.

[2]. اسراء / ۷۹،

[3]. ضحیٰ / ۵

کہ تم خوش ہو جاؤگے حضور کی شفاعت کے ذریعہ الٰہی بخشش کی طرف اشارہ ہے جو مستحق افراد کے شامل حال ہو گی.

اس بناپر گنہگار مومنین کی سب سے بڑی اور آخری امید اور آسرا شفاعت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے عذاب سے امان کا یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیشہ یہ خوف دل میں جاگتا رہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا فعل سر زد ہو جائے جو مرتے دم تک کبھی بھی اس کی عاقبت کی بربادی یا ایمان کے سلب ہو جانے کا سبب بن جائے ،اور خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں اس حد تک رسوخ کر جائے کہ (معاذاللہ) وہ اللہ کی دشمنی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں . اس لئے وہ لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ہے جو ان کے اور ان کی محبوب اور معشوق اشیاء کے درمیان موت کے ذریعہ جدائی ڈال دیتا ہے .

شفاعت کا مفہوم

شفاعت ،مادہ شفع سے لیا گیا ہے جو جوڑے کے معنی میں ہے اور عرف عام میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گذار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے اور شاید ایسے مقامات پر لفظ شفاعت کو استعمال کرنے کا نکتہ یہ ہو کہ مجرم انسان خود بخود بخشے جانے کا مستحق نہیں ہوتا، یا خدمت کار خود بخود اجرت میں اضافہ کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن سفارش کرنے والے (شفیع) کی درخواست کا منسلک ہو جانا اسے اس کا مستحق بنا دیتا ہے عام حالات میں کوئی کسی سفارش کرنے والے کی سفارش کو اس لئے قبول کر لیتا ہے کہ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی سفارش کو قبول نہ کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کا رنجیدہ خاطر ہونا اس کی الفت یا خدمت کی لذت سے محرومی کا سبب بنے گا، یا ممکن ہے کہ سفارش کرنے والے کی جانب سے نقصان پہنچنے کا باعث ہو. وہ مشرکین جو اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کے لئے انسانی اوصاف کے قائل تھے، جیسے شریک حیات ، مونس و مددگار دوست ،ہم مشغلہ ساتھی کی محبت کی ضرورت یا اپنے رقیب اور اپنے برابر کی شخصیت سے خوف وغیرہ، وہ خدا کے لئے ان سب صفات کے اس لئے قائل تھے، کہ ان کی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کے غضب سے محفوظ رہیں، اور اسی لئے وہ لوگ بتوں اور مجسموں کے مقابلہ میں فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے. هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِندَ

اللّٰہِ [۱] یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں اور کہتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ [۲] ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنادیں.

اور قرآن مجید ان لوگوں کے جاہلانہ خیالات کو اس طرح باطل کرتے ہوئے فرماتا ہے: لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ [۳] اللہ کے سوا اس کا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ ہی شفاعت کنندہ.

لیکن غور و فکر کا مقام ہے کہ ایسے شفاعت کرنے والوں اور ایسی شفاعت کی نفی کرنے کے معنی مطلقاً شفاعت کا انکار کرنا نہیں ہے، خود قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جو شفاعت کو (خدا کی اجازت اور اس کے اذن سے ثابت کرتی ہیں)

(شفاعت باذن اللہ) اور وہ آیات شفاعت کرنے والوں اور جنکی شفاعت کی جائے گی ان کی شرائط کو بھی بیان کر رہی ہیں اور خدا کی جانب سے اجازت یافتہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا، کسی خوف یا ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے خداوند عالم نے ان لوگوں کے لئے کھولا ہے، جن کے اندر رحمت الٰہی، کی لیاقت کم پائی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ شرطیں اور اصول قرار دیئے ہیں. در حقیقت صحیح شفاعت پر عقیدہ، اور شرک آمیز شفاعت پر عقیدہ کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق، خدا کی جانب سے حاکمیت اور تدبیر، اور خود مختار حاکمیت وتدبیر کے درمیان ہے. یہ بحث خدا شناسی کے باب میں بیان ہو چکی ہے. [۴] کبھی کبھی شفاعت کا لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے کے ذریعہ اچھا اثر ظاہر ہونے کو بھی شامل ہے جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یا اس کے برعکس، اسی طرح معلم اور رہنما اپنے شاگردوں کے متعلق اور یہاں تک کہ موذن ان لوگوں کے متعلق جو اس کی آواز کو سن کر نماز کو یاد کرتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شفاعت کریں گے اور در حقیقت ہر نیک کام جو اس دنیا میں انجام دیا گیا ہے وہ شفاعت اور مدد کی شکل قیامت کے دن ظاہر ہوگا.

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ گنہگاروں کی توبہ واستغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور یہاں تک کہ دوسروں کے حق میں دعا کرنا اور خدا سے ان کی حاجتوں کو پورا ہونے کی درخواست کرنا در حقیقت خدا کے

---

[۱]. یونس/۱۸

[۲]. زمر/۳

[۳]. انعام/۷۰

[۴]. رجوع کریں، باب خدا شناسی درس نمبر ۱۶.

نزدیک شفاعت شمار کی جاتی ہے، کیونکہ یہ ساری چیزیں خدا کے نزدیک کسی انسان تک نیکی پہنچانے یا کسی سے شرک کو دور کرنے کے ذریعہ ہے.

شفاعت کے اصول

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کرنے یا شفاعت پانے کے لئے بنیادی شرط خدا کی اجازت ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵، میں ارشاد ہوا ہے'' مَن ذَالَّذِی یَشفَعُ عِندَہُ اِلَّا بِاِذنِہِ '' کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے ،اور سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ میں یوں ارشاد ہے : ''مَا مِن شَفِیعٍ اِلَّا مِن بَعدِ اِذنِہِ '' کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد اور سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں بھی ارشاد ہو رہا ہے : یَومَئِذٍ لَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ الرَّحمٰنُ وَ رَضِیَ لَہُ قَولاً اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی، سوائے ان کے جنھیں خدا نے اجازت دیدی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو اور سورہ سباء کی آیت نمبر ۲۳ میں فرماتا ہے: وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِندَہُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ . اس کے نزدیک کسی کی سفارش کام نہ آئے گی مگر اس کی جس کو اجازت دے دی گئی ہو.

ان آیات سے اجمالی طور سے خدا کی اجازت ثابت ہوتی ہے لیکن اجازت یافتہ افراد کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا.

سبق نمبر ۱۹

لیکن دوسری آیات کے ذریعہ طرفین (شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے) کی شرطوں کو واضح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے:

وَلا یَملِکُ الَّذِینَ یَدعُونَ مِن دُونِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَن شَھِدَ بِالحَقِّ وَ ھُم یَعلَمُونَ اور وہ لوگ جو خدا کے علاوہ کسی اور کو آواز دیتے ہیں شفاعت کا حق نہیں رکھتے (اور کسی کو بھی شفاعت کا حق نہیں) مگر وہ جو حق کی گواہی دے اور علم بھی رکھتا ہو، شاید مَن شَھِدَ بِالحَق سے مراد اعمال کے اوپر گواہ فرشتے ہوں جو خدا کی تعلیم کے ذریعہ بندوں کے اعمال اور نیتوں سے واقف رہتے ہیں اور ان کی رفتار و کردار کی قدر و قیمت اور کیفیت پر شہا

دت دے سکتے ہیں، جیساکہ حکم اور موضوع کے تناسب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ سفارش کرنے والوں کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ جو شفاعت پانے والوں کی صلاحیت کی تشخیص دے سکیں.

اور یقینی طور سے ان دونوں شرائط کے حامل وہ معصومین علیہم السلام ہیں، دوسری طرف سے بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت پانے والے مرضی خدا کے حق دار ہوں گے جیساکہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہے: وَلَا يَشفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ اِرتَضىٰ سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے اور سورہ نجم کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے: وَكَم مِن مَلَكٍ فِي السَّموات لَا تُغنِي شَفَاعَتُهُم شَيئًا اِلَّا مِن بَعدِ اَن يَأذَنَ اللّٰهُ لِمَن يَشَاء وَيَرضىٰ اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کام نہیں آسکتی، جب تک خداوند متعال جس کے بارے میں چاہے اور پسند کرے اجازت نہ دیدے.

مذکورہ مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین وایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو جیساکہ روایات میں اسی عنوان سے تفسیر ہوئی ہے.

دوسری طرف چند آیتوں میں ان لوگوں کی خصلت جن کی سفارش نہیں ہو سکتی بیان کی گئی ہے، جیسے سورہ شعراء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مشرکین کے قول کو نقل کر رہا ہے فَمَا لَنَا مِن شَافِعِين اور سورہ مدثر کی آیت نمبر ۴۰/ سے ۴۸/ تک آیا ہے کہ مجرموں کے دوزخ میں جانے کے سبب کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ لوگ جواب میں ترکِ نماز[1] بیکسوں کی مدد نہ کرنے روز قیامت کے جھٹلانے کی خصلت کو گنوائیں گے. اس کے بعد ارشاد ہے فَمَا تَنفَعُهُم شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ مشرکین اور قیامت کا انکار کرنے والے جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس کے محتاج بندوں کی مدد نہیں کرتے، اور وہ صحیح اصولوں اور قوانین کے پابند نہیں ہیں شفاعت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی اور اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استغفار کرنا بھی اس دنیا میں ایک طرح کی شفاعت ہے اور ان کا استغفار کرنا ان لوگوں کے حق میں جو اس بات کے لئے حاضر نہیں ہیں، آپ سے استغفار و شفاعت کی درخواست کریں شامل نہیں ہوگا[2]

[1]. امام صادق (ع) اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا: (انّ شفاعتنا لا تنال من استخف بالصلوٰۃ) ہماری شفاعت اس انسان تک نہیں پہنچ سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے. بحار الانوار/ ج ۴ ص ۲

[2]. منافقون/ ۶، ۵

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفاعت کا انکار کرنے والا بھی شفاعت کا حق دار نہیں ہے جیسا کہ یہی مضمون احادیث میں ذکر ہوا ہے.[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ مطلّقا سفارش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی اجازت کے علاوہ خود بھی معصیت کار نہ ہو اور دوسروں کے گناہ اور اطاعت کے مراتب کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو نیز سچے پیروکار بھی ان کے زیر سا یہ شفاعت کے کمترین مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں، جیسا کہ ایسے افراد شہداء اور صدیقین کے زمرہ میں محشور کئے جا ئیں گے[2] اور دوسری طرف صرف وہ لوگ شفاعت پانے کا حق رکھتے ہیں جو خدا کی اجازت کے علاوہ خدا و رسول اور قیامت اور وہ چیزیں جو خدا نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی ہیں جیسے شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھنا، نیز اس اعتقاد پر آخر دم تک باقی رہنا ہے.

خلاصہ

۱. عرف عام میں شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی با عزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گزار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے.

۲. شفاعت وہ لوگ کر سکیں گے جنھیں خدا کی طرف سے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی ہے.

۳. گنہکاروں کی توبہ و استغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور دوسروں کے حق میں دعا کرنا بھی شفاعت ہے.

۴. رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین و ایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو.

۵. تارک نماز، بے کسوں کی مدد نہ کرنے والا، روز قیامت کو جھٹلانے والا، خدا کی عبادت نہ کرنے والا اور شفاعت کے انکار کرنے والے، شفاعت کے حقدار نہیں ہیں.

---

[1]. (عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَن لم یؤمن بشفاعتی فلا انالہ اللہ شفاعتی) جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا میری شفاعت کو اس کے شامل حال نہیں کرے گا، بحار لانوار ج۸ ص ۵۸،

[2]. والذین آمنوا باللہ ورسولہ اولئک ھم الصدقون والشداء عند ربھم (جو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے خدا کے نزدیک وہی لوگ صدیقین اور شہداء ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

بیسواں سبق

شفاعت ۲

بیچلر B.A

تمہید

شفاعت کے متعلق بہت سے اعتراضات اور شبہات ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے بعض اہم شبہات کا ذکر ہم اس درس میں کرنا چاہتے ہیں تاکہ مخاطب کی اس حوالے سے ذہنیت درست ہوسکے.

تفصیل

شبہ نمبر۱

سب سے پہلا شبہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ قیامت کے روز کسی کی شفاعت کو قبول نہ کیا جائے گا، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۸ میں ارشاد ہو رہا ہے **وَاتَّقُوا يَوماً لَا تَجزِي نَفسٍ عَن نَفسٍ شيئاً وَ لَا يُقبَلُ مِنهَا شَفاعَةٌ وَ لَا يُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ وَلَا هُم يُنصَرُونَ** اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے عوض اور بدلہ لیا جائے گا، اور نہ اس کی کوئی مدد کی جائے گا.

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیات بے اصول اور استقلالی (خود مختار) شفاعتوں کی نفی میں ہے کہ بعض لوگ جس کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذکورہ آیات عام ہیں اور یہ ان آیات کے ذریعہ جو شفاعت کے قبول کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص پا گئی ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے.

شبہ نمبر۲

شفاعت کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آگیا ہے یعنی ان لوگوں کی شفاعت خدا کے بخش دیئے جانے کا سبب بن گئی جبکہ وہ خدا فعل ہے

جواب: شفاعت کے قبول ہونے کا معنی زیر اثر آنا نہیں (متاثر) ہے جیسا کہ دعا اور توبہ کا قبول ہونا ایسا غلط معنی نہیں رکھتا کیونکہ ان سارے مقامات پر بندوں کے کام رحمت الٰہی کے قبول کرنے کی آمادگی کا سبب اور ذریعہ ہیں

اور اس اصطلاح (مقولے) کے لحاظ سے کہ قبول کرنے والے کی قابلیت شرط ہے نہ کہ انجام دینے والے کی فا علیت .

شبہہ نمبر ۳

شفاعت کا لازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے بھی زیادہ مہربان ہو گئے ہیں، کیونکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوئی تو گنہگار عذاب میں مبتلا ہو جاتا یا اس کا عذاب دائمی ہو جاتا .

جواب : شفاعت کرنے والوں کی ہمدردی یا مہربانی خدا کی بے پایا رحمت کی ایک جھلک ہے یا یوں کہا جائے کہ شفا عت ایک ایسا راستہ ہے، جسے خود پروردگار عالم نے اپنے گنہگار بندوں کے لئے قرار دیا ہے اور حقیقت میں اس کی رحمت کے مجسم اور ظاہر ہونے کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جو اس کے نیک اور منتخب بندوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے، اور اسی طرح توبہ اور دعا بھی دوسرے وسیلے ہیں، کہ جنھیں خدا نے مرادوں کے پوری ہونے اور گناہوں کے بخشے جانے کے لئے قرار دیا ہے .

شبہہ نمبر ۴

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اگر گنہگاروں کے عذاب کے متعلق خدا کا حکم اس کی عدالت کا تقاضا ہوتا تو ان لوگوں کے لئے شفاعت کا قبول کر لینا اس کی عدالت کے خلاف ہوگا .

جواب : جتنے بھی احکام الٰہی ہیں چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم یا شفاعت کے بعد عذاب سے نجات کا حکم، اس کی عدل و حکمت کے مطابق ہے اور دونوں حکموں کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے میں دو ضدوں کے جمع ہونے والی نسبت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا موضوع الگ ہے اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے ان اسباب سے قطع نظر کہ جو گنہگار کے حق شفاعت کے قبول کا موجب ہے اور عذاب سے نجات کا مذکورہ حکم اسباب کے ظہور کا سبب ہے اور حکم کا بدلنا موضوع کی قید کے بدلنے کے تابع ہے، بہت فراوانی کے ساتھ جس کی مثال احکام اور تکوینی مقدرات اور تشریعی احکام و قوانین کے اندر مل جائیں گی اور اسی طرح اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے حکم منسوخ اور حکم ناسخ کے عادلانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے، نیز دعا اور

صدقہ دینے سے مصیبتوں کے بر طرف ہونے کے حکیمانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے اور شفاعت کے بعد گناہوں کے بخشے جانے کا حکم، شفاعت کے تحقق سے پہلے عذاب کے حکم کے منافی نہیں ہے .

شبہہ نمبر ۵

ایک اور اشکال یہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے: جیسا کہ سورہ حجر کی آیت نمبر ۴۳، ۴۲ میں ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ عِبَادِي لَيسَ لَکَ عَلَيهِم سُلطَانٌ اِلَّا مَنِاتَّبَعَکَ مِنَ الغَاوِين* وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوعِدُهُم اَجمَعِينَ بیشک تو (اے ابلیس!) میرے بندوں پر مسلط نہیں ہو سکتا، مگر وہ گمراہ لوگ جو تیری پیروی کریں اور ان کی ہمیشہ کی جگہ جہنم ہے .

اور حقیقت میں گنہگاروں کو قیامت میں عذاب میں گرفتار کرنا، خدا کی سنت ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں سنت خدا، تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت نمبر ۴۳ میں فرماتا ہے: فَلَن تَجدَ لِسَنَّةِ اللّٰهِ تَبدِيلًا وَلَن تَجدَ لِسُنَّةُ اللّٰهِ تَحوِيلاً تم ہرگز سنت الٰہی میں تبدیلی نہیں پاؤگے اور ہرگز سنت پروردگار میں تغیر نہیں پا سکتے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ یہ سنت شفاعت کے ذریعہ ٹوٹ جائے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ واجد الشرائط گنہگاروں کے بارے میں شفاعت کا قبول کرنا، خدا کی نا قابل تبدیل سنتوں میں سے ایک ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند عالم کی سنت، حقیقی معیار اور ملاک کے تابع ہے اور کوئی بھی سنت جس کے سارے تقاضے، اور وجودی و عدمی شرائط پائے جائیں گے وہ تبدیلی کو قبول نہیں کر سکتی، لیکن وہ عبارتیں جو اس سنت پر دلالت کرتی ہیں وہ پوری طرح سے موضوع اور اس کے تمام شرائط و قیود کو بیان نہیں کر رہی ہیں، اس رو سے ایسے موراد پائے جاتے ہیں کہ جہاں ظاہری طور سے آیات چند مختلف سنتوں کو شامل ہے جب کہ حقیقت میں آیت کا مصداق اخص اور اقوی ملاک کا تابع ہے لہٰذا ہر سنت اپنے موضوع کی واقعی قیود و شرائط کو دیکھتے ہوئے (نہ صرف وہ قیدیں اور شرطیں جو عبارت میں ائیں ہیں) ثابت اور غیر قابل تغیر ہے انھیں میں سے ایک سنت کا نام شفاعت ہے جو خاص گنہگاروں کے لئے جن کے اندر معین شرائط پائے جاتے ہو ں اور معین اصول و قوانین ان کے شامل حال ہے ثابت اور نا قابل تبدیل ہے .

شبہہ نمبر۶

شفاعت کا وعدہ، لوگوں کو گناہ کے مرتکب ہونے اور بے راہ روی میں گستاخ اور جری بنا دیتا ہے.

جواب: اس اعتراض کا جواب توبہ قبول ہونے اور گناہوں کے ختم ہو جانے کے سلسلے میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت اور مغفرت کا شامل حال ہونا، کچھ شرائط کے اوپر موقوف ہے کہ گنہگار انسان ان شرائط کے حصول کا یقین نہیں حاصل کر سکتا اور شفاعت پانے کے من جملہ شرائط یہ ہیں کہ انسان اپنے ایمان کو تادم مرگ بچا لے جائے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان ایسی شرط کے پورے ہونے کا یقین نہیں کر سکتا دوسری طرف سے اگر کوئی انسان کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا اور اسے اپنے اس گناہ کی بخشش کی کوئی امید ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی میں گرفتار ہو جائیگا اور مایوسی اس کے اندر گناہ کو ترک کرنے کے حوصلہ کو ضعیف کر دے گی نیز اسے آئندہ اسی غلط راستے پر چلنے کی ترغیب دلا دے گی اسی لئے الٰہی مربی کی روشن تربیت یہ ہے کہ ہمیشہ لوگوں کو خوف اور امید کے درمیان ورکے رکھے یعنی رحمت الٰہی اتنا امید وار نہ بنا دے کہ خدا کے یہاں سے اطمینان حاصل کر لیں، اور عذاب الٰہی سے بھی اتنا نہ ڈرا دے کہ رحمت خدا سے مایوس ہو جائیں اور ہم یہ جانتے ہیں یہ دونوں چیزیں گناہان کبیرہ ہیں.

شبہہ نمبر۷

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے میں شفاعت کی تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا کام (شفاعت کرنے والے) سعادت تک پہچانے اور بدبختی سے نجات پانے میں اثر رکھتا ہے درآں حالیکہ اس آیہ شریفہ کے لحاظ سے وَاَن لَیسَ لِلاِ نسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ صرف شخص کی اپنی کوشش ہے جو اسے سعادت تک پہنچاتی ہے.

جواب: انسان کی سعی اور کوشش منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کبھی تو بطور مستقیم ہوئی ہے، اور یہ کوشش راستہ کے آخری حصہ تک جاری رہتی ہے اور کبھی غیر مستقیم ہے جو مقدمات اور واسطوں کو فراہم کرنے کے ذریعہ ہوتی ہے، شفاعت پانے والا شخص بھی سعادت تک پہنچنے کے مقدمات اور واسطوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ،اس لئے کہ ایمان لانا اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا، سعادت تک پہنچنے کی راہ میں سعی و کوشش شمار کی جاتی ہے، چاہے یہ کوشش ناقص ہی کیوں نہ ہو، اسی لئے کچھ مدت تک برزخ کی مصیبتوں اور پریشانیوں اور عرصہ قیامت کی ابتدائی سختیوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے لیکن بہر حال خود اس نے سعادت کی جڑ یعنی ایمان کو

اپنے دل کے اندر مضبوط کرتے ہوئے اس کو نیک اعمال کے ذریعہ اس طرح آبیاری کرتا رہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے پائے لہٰذا اس کی آخری سعادت خود اسی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اگرچہ شفاعت کرنے والے بھی اس درخت کے بارآور ہونے میں اثر رکھتے ہیں، جس طرح دنیا میں بھی بعض دوسرے افراد انسانوں کی ہدایت اور ان کی تربیت میں موثر ہیں، اور ان کی تاثیر خود شخص کی سعی و کوشش کی نفی کے معنی میں نہیں ہے.

خلاصہ

چند شبہات

قیامت کے روز کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، شفاعت کا مطلب یعنی خدا شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آ گیا ہے. شفاعت کرنے والے، خدا سے زیادہ مہربان ہیں، خدا کا شفاعت قبول کرنا اس کی عدالت کے خلاف ہے. خدا نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے. شفاعت کا وعدہ لوگوں کو بے راہ روی میں گستاخ اور جری بنا دیتا ہے، انسان اپنی کوشش سے سعادت تک پہنچتا ہے نہ کہ شفاعت کرنے والوں کی وجہ سے.

جوابات:

بے اصولی اور استقلالی و خودمختار شفاعتوں کی نفی کی گئی ہے، خدا پر شفاعت کرنے والوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، شفاعت کرنے والے خدا سے زیادہ مہربان نہیں ہیں، شفاعت خدا کی عدالت کی منافی نہیں ہے، شفاعت خدا کی سنت کی تبدیلی کا سبب نہیں ہے، شفاعت کا وعدہ لوگوں کی گستاخی اور جسارت کا باعث نہیں ہے اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا سعادت تک پہنچنے کی کوشش ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

اکیسواں سبق

شفاعت ۲

بیچلر B.A

تمہید

شفاعت کے متعلق بہت سے اعتراضات اور شبہات ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے بعض اہم شبہات کا ذکر ہم اس درس میں کرنا چاہتے ہیں تاکہ مخاطب کی اس حوالے سے ذہنیت درست ہوسکے.

تفصیل

شبہ نمبر۱

سب سے پہلا شبہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ قیامت کے روز کسی کی شفاعت کو قبول نہ کیا جائے گا، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۸ میں ارشاد ہو رہا ہے **وَاتَّقُوا يَوماً لَا تَجزِي نَفسٍ عَن نَفسٍ شيئاً وَ لَا يُقبَلُ مِنهَا شَفاعَةٌ وَ لَا يُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ وَلَا هُم يُنصَرُونَ** اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے عوض اور بدلہ لیا جائے گا، اور نہ اس کی کوئی مدد کی جائے گا.

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیات بے اصول اور استقلالی (خود مختار) شفاعتوں کی نفی میں ہے کہ بعض لوگ جس کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذکورہ آیات عام ہیں اور یہ ان آیات کے ذریعہ جو شفاعت کے قبول کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص پا گئی ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے.

شبہ نمبر۲

شفاعت کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آگیا ہے یعنی ان لوگوں کی شفاعت خدا کے بخش دیئے جانے کا سبب بن گئی جبکہ وہ خدا فعل ہے

جواب: شفاعت کے قبول ہونے کا معنی زیر اثر آنا نہیں (متاثر) ہے جیسا کہ دعا اور توبہ کا قبول ہونا ایسا غلط معنی نہیں رکھتا کیونکہ ان سارے مقامات پر بندوں کے کام رحمت الٰہی کے قبول کرنے کی آمادگی کا سبب اور ذریعہ ہیں

اور اس اصطلاح (مقولے) کے لحاظ سے کہ قبول کرنے والے کی قابلیت شرط ہے نہ کہ انجام دینے والے کی فاعلیت .

شبہہ نمبر ۳

شفاعت کا لازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے بھی زیادہ مہربان ہو گئے ہیں، کیونکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوئی تو گنہگار عذاب میں مبتلا ہو جاتا یا اس کا عذاب دائمی ہو جاتا .

جواب : شفاعت کرنے والوں کی ہمدردی یا مہربانی خدا کی بے پایا رحمت کی ایک جھلک ہے یا یوں کہا جائے کہ شفاعت ایک ایسا راستہ ہے، جسے خود پروردگار عالم نے اپنے گنہگار بندوں کے لئے قرار دیا ہے اور حقیقت میں اس کی رحمت کے مجسم اور ظاہر ہونے کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جو اس کے نیک اور منتخب بندوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے، اور اسی طرح توبہ اور دعا بھی دوسرے وسیلے ہیں، کہ جنھیں خدا نے مرادوں کے پوری ہونے اور گناہوں کے بخشے جانے کے لئے قرار دیا ہے .

شبہہ نمبر ۴

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اگر گنہگاروں کے عذاب کے متعلق خدا کا حکم اس کی عدالت کا تقاضا ہوتا تو ان لوگوں کے لئے شفاعت کا قبول کر لینا اس کی عدالت کے خلاف ہوگا .

جواب : جتنے بھی احکام الٰہی ہیں چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم یا شفاعت کے بعد عذاب سے نجات کا حکم، اس کی عدل و حکمت کے مطابق ہے اور دونوں حکموں کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے میں دو ضدوں کے جمع ہونے والی نسبت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا موضوع الگ ہے اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے ان اسباب سے قطع نظر کہ جو گنہگار کے حق شفاعت کے قبول کا موجب ہے اور عذاب سے نجات کا مذکورہ حکم اسباب کے ظہور کا سبب ہے اور حکم کا بدلنا موضوع کی قید کے بدلنے کے تابع ہے، بہت فراوانی کے ساتھ جس کی مثال احکام اور تکوینی مقدرات اور تشریعی احکام و قوانین کے اندر مل جائیں گی اور اسی طرح اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے حکم منسوخ اور حکم ناسخ کے عادلانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے، نیز دعا اور

صدقہ دینے سے مصیبتوں کے بر طرف ہونے کے حکیمانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے اور شفاعت کے بعد گناہوں کے بخشے جانے کا حکم، شفاعت کے تحقق سے پہلے عذاب کے حکم کے منافی نہیں ہے.

شبہہ نمبر ۵

ایک اور اشکال یہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے: جیسا کہ سورہ حجر کی آیت نمبر ۴۳، ۴۲ میں ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ عِبَادِي لَيسَ لَکَ عَلَيهِم سُلطَانٌ اِلَّا مَنِاتَّبَعَکَ مِنَ الغَاوِين* وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوعِدُهُم اَجمَعِينَ بیشک تو (اے ابلیس!) میرے بندوں پر مسلط نہیں ہو سکتا، مگر وہ گمراہ لوگ جو تیری پیروی کریں اور ان کی ہمیشہ کی جگہ جہنم ہے.

اور حقیقت میں گنہگاروں کو قیامت میں عذاب میں گرفتار کرنا، خدا کی سنت ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں سنت خدا، تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت نمبر ۴۳ میں فرماتا ہے: فَلَن تَجدَ لِسَنَّةِ اللّٰهِ تَبدِيلًا وَلَن تَجدَ لِسُنَّةُ اللّٰهِ تَحوِيلاً تم ہرگز سنت الٰہی میں تبدیلی نہیں پاؤگے اور ہرگز سنت پروردگار میں تغیر نہیں پا سکتے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ یہ سنت شفاعت کے ذریعہ ٹوٹ جائے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ واجد الشرائط گنہگاروں کے بارے میں شفاعت کا قبول کرنا، خدا کی ناقابل تبدیل سنتوں میں سے ایک ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند عالم کی سنت، حقیقی معیار اور ملاک کے تابع ہے اور کوئی بھی سنت جس کے سارے تقاضے، اور وجودی و عدمی شرائط پائے جائیں گے وہ تبدیلی کو قبول نہیں کر سکتی، لیکن وہ عبارتیں جو اس سنت پر دلالت کرتی ہیں وہ پوری طرح سے موضوع اور اس کے تمام شرائط و قیود کو بیان نہیں کر رہی ہیں، اس رو سے ایسے موراد پائے جاتے ہیں کہ جہاں ظاہری طور سے آیات چند مختلف سنتوں کو شامل ہے جب کہ حقیقت میں آیت کا مصداق اخص اور اقوی ملاک کا تابع ہے لہٰذا ہر سنت اپنے موضوع کی واقعی قیود و شرائط کو دیکھتے ہوئے (نہ صرف وہ قیدیں اور شرطیں جو عبارت میں ائیں ہیں) ثابت اور غیر قابل تغیر ہے انھیں میں سے ایک سنت کا نام شفاعت ہے جو خاص گنہگاروں کے لئے جن کے اندر معین شرائط پائے جاتے ہو ں اور معین اصول و قوانین ان کے شامل حال ہے ثابت اور ناقابل تبدیل ہے.

شبہہ نمبر۶

شفاعت کا وعدہ، لوگوں کو گناہ کے مرتکب ہونے اور بے راہ روی میں گستاخ اور جری بنا دیتا ہے.

جواب: اس اعتراض کا جواب توبہ قبول ہونے اور گناہوں کے ختم ہو جانے کے سلسلے میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت اور مغفرت کا شامل حال ہونا، کچھ شرائط کے اوپر موقوف ہے کہ گنہگار انسان ان شرائط کے حصول کا یقین نہیں حاصل کر سکتا اور شفاعت پانے کے من جملہ شرائط یہ ہیں کہ انسان اپنے ایمان کو تادم مرگ بچا لے جائے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان ایسی شرط کے پورے ہونے کا یقین نہیں کر سکتا دوسری طرف سے اگر کوئی انسان کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا اور اسے اپنے اس گناہ کی بخشش کی کوئی امید ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی میں گرفتار ہو جائیگا اور مایوسی اس کے اندر گناہ کو ترک کرنے کے حوصلہ کو ضعیف کر دے گی نیز اسے آئندہ اسی غلط راستے پر چلنے کی ترغیب دلا دے گی اسی لئے الٰہی مربی کی روشن تربیت یہ ہے کہ ہمیشہ لوگوں کو خوف اور امید کے درمیان ورکے رکھے یعنی رحمت الٰہی اتنا امید وار نہ بنا دے کہ خدا کے یہاں سے اطمینان حاصل کر لیں، اور عذاب الٰہی سے بھی اتنا نہ ڈرا دے کہ رحمت خدا سے مایوس ہو جائیں اور ہم یہ جانتے ہیں یہ دونوں چیزیں گناہان کبیرہ ہیں.

شبہہ نمبر۷

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے میں شفاعت کی تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا کام (شفاعت کرنے والے) سعادت تک پہچانے اور بدبختی سے نجات پانے میں اثر رکھتا ہے درآں حالیکہ اس آیہ شریفہ کے لحاظ سے وَاَن لَیسَ لِلاِ نسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ صرف شخص کی اپنی کوشش ہے جو اسے سعادت تک پہنچاتی ہے.

جواب: انسان کی سعی اور کوشش منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کبھی تو بطور مستقیم ہوئی ہے، اور یہ کوشش راستہ کے آخری حصہ تک جاری رہتی ہے اور کبھی غیر مستقیم ہے جو مقدمات اور واسطوں کو فراہم کرنے کے ذریعہ ہوتی ہے، شفاعت پانے والا شخص بھی سعادت تک پہنچنے کے مقدمات اور واسطوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ،اس لئے کہ ایمان لانا اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا، سعادت تک پہنچنے کی راہ میں سعی و کوشش شمار کی جاتی ہے، چاہے یہ کوشش ناقص ہی کیوں نہ ہو، اسی لئے کچھ مدت تک برزخ کی مصیبتوں اور پریشانیوں اور عرصہ قیامت کی ابتدائی سختیوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے لیکن بہر حال خود اس نے سعادت کی جڑ یعنی ایمان کو

اپنے دل کے اندر مضبوط کرتے ہوئے اس کو نیک اعمال کے ذریعہ اس طرح آبیاری کرتا رہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے پائے لہٰذا اس کی آخری سعادت خود اسی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اگرچہ شفاعت کرنے والے بھی اس درخت کے بارآور ہونے میں اثر رکھتے ہیں، جس طرح دنیا میں بھی بعض دوسرے افراد انسانوں کی ہدایت اور ان کی تربیت میں موثر ہیں، اور ان کی تاثیر خود شخص کی سعی و کوشش کی نفی کے معنی میں نہیں ہے.

خلاصہ

چند شبہات

قیامت کے روز کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، شفاعت کا مطلب یعنی خدا شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آ گیا ہے. شفاعت کرنے والے، خدا سے زیادہ مہربان ہیں، خدا کا شفاعت قبول کرنا اس کی عدالت کے خلاف ہے. خدا نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے. شفاعت کا وعدہ لوگوں کو بے راہ روی میں گستاخ اور جری بنا دیتا ہے، انسان اپنی کوشش سے سعادت تک پہنچتا ہے نہ کہ شفاعت کرنے والوں کی وجہ سے.

جوابات:

بے اصولی اور استقلالی و خودمختار شفاعتوں کی نفی کی گئی ہے، خدا پر شفاعت کرنے والوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، شفاعت کرنے والے خدا سے زیادہ مہربان نہیں ہیں، شفاعت خدا کی عدالت کی منافی نہیں ہے، شفاعت خدا کی سنت کی تبدیلی کا سبب نہیں ہے، شفاعت کا وعدہ لوگوں کی گستاخی اور جسارت کا باعث نہیں ہے اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا سعادت تک پہنچنے کی کوشش ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

بائیسواں سبق

توسل

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد میں سے ایک توسل کا عقیدہ ہے اگرچہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد اس کا انکار کرتی ہے لیکن جب اس موضوع کو قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں اس کے متقن اور یقینی دلائل نظر آتے ہیں. پیش نظر سبق میں ہم توسل کا مفہوم بین کریں گے اور بتائیں گے کہ توسل سے ہماری مراد کیا ہے اس کے بعد توسل کی اقسام کا ذکر آئے گا، جہاں یہ بتایا جائے گا کہ کن چیزوں سے ذات پروردگار سے توسل کرنے میں سہارا لیا جاسکتا ہے. اور آخر میں اس موضوع کے کچھ سوال اور دلائل بھی بیان کیے جائیں گے. اگرچہ اس کی تفصیلی بحث کا مقام عقائد کی تفصیلی کتابیں ہی ہیں جہاں مدلل اور مبرہن بحثیں کی گئی ہیں.

تفصیل

لفظ توسل، مادہ "وسل" سے مشتق ہے اور یہ کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں آتا ہے. اور اسی لغوی معنی کے پیش نظر، وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
حدیث میں یوں ملتا ہے: "اللَّهُمَّ آتِ مُحَمَّداً صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَ آلِهِ الْوَسِيلَةَ وَ الرِّفْعَةَ وَ الْفَضِيلَةَ"[1]
اس سے مراد وہ مقام شفاعت ہے جو قیامت کے دن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا جائے گا.
قرآن مجید مؤمنین کو خدا کی قرابت حاصل کرنے کے لئے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ"[2]
اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت انسان کو خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلوں کی ضرورت ہے. جن کے نتیجے میں انسان کو قرب معنوی الہی حاصل ہوتا ہے.
اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وسیلہ کیا ہے.
نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ایک سو دس میں، قرب خدا کے حصول کے لئے اس وسیلہ کے بعض مصادیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "بہترین وسیلہ کہ جس کے ذریعے لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں، خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر پر ایمان رکھنا ہے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے، اسی طرح

---

[1]. التہذیب/ج ۴/ص ۸۲
[2]. مائدہ/۳۵

نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا، اور باقی نیک اعمال کو بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

توسل کی اقسام

شریعت مقدسہ میں بہت ساری چیزیں وارد ہوئی ہیں جن کے ذریعے بارگاہ خدا میں توسل کیا جا سکتا ہے، جن میں سے بعض چیزوں کی طرف حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی کلام میں اشارہ کیا گیا ہے.

۱. اللہ تعالی کی اسماء و صفات سے توسل کرنا.

قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے: ''وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا''[۱]

اسی بنا پر قرآن مجید اور سنت میں ذکر کیے گئے خدا کے ناموں کے ساتھ اس کی بارگاہ میں توسل کیا جا سکتا ہے، چاہے وہ نام صفات ذاتی سے حکایت کر رہا ہو، جیسے عالم، قادر، حی یا صفات فعل کو بیان کر رہا ہو، جیسے خالق، رازق یا پھر خداوند کی ذات سے ہر ایک عیب و نقص کی نفی کر رہا ہو جیسے قدوس، یا کمال الہی کو بیان کر رہا ہو، جیسے سمیع، بصیر و خبیر.

۲. قرآن مجید کی عظمت سے توسل، کیونکہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں قرآن کریم کا بہت عظیم مقام ہے. اسی کتاب میں توسل کے بارے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ پیغمبر اکرم کی سیرت اور آئمہ علیہم السلام کی زندگی میں اسی توسل کے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں . ان واقعات میں سے ایک واقعہ عریض بن عبداللہ سجستانی کا ہے اس واقعہ میں وہ امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا کہ شب قدر میں من جملہ مستحبات میں سے ایک مستحب یہ ہے کہ انسان قرآن کو اپنے سر پر رکھے اور خاص دعا کا ورد کرے، یہاں سے قرآن کے ساتھ تمسک کرنا سمجھ میں آتا ہے.

۳. انسان کا اپنے نیک اعمال کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں توسل کرنا یعنی جو بھی نیک اعمال انسان انجام دیتا ہے انہیں اپنے لیے وسیلہ قرار دے سکتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی تعمیر کے بعد اسی نیک کام کو

---

[۱]. اعراف/۱۸۰

اپنے لیے وسیلہ قرار دیا اور فرمایا: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.[1]

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر اور ہمیں ہماری عبادت کی حقیقت سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما، یقینا تو بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۴. اپنے مومن بھائی کی دعا کے ذریعہ توسل کرنا جیسے وہ مومن بھائی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے لیے دعا کرنا یہ بھی ایک قسم کا توسل ہے یعنی دوسروں کے لیے دعا کرنا بھی توسل کی اقسام میں سے ہے.

۵. کسی بھی پیغمبر کا اپنی حیات میں کسی دوسرے کے حق میں دعا کرنا جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں کا اپنے باپ سے کہنا کہ ہمارے لیے دعا کرو اور پھر حضرت یعقوب کا دعا کا وعدہ کرنا. اور اسی طرح پیغمبر گرامی اسلام کا اپنی امت کے لیے دعا کرنا. قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ. قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[2]

ترجمہ: بیٹوں نے کہا: اے ہمارے ابا! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے، ہم ہی خطاکار تھے۔ (یعقوب نے) کہا: عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا، وہ یقینا بڑا بخشنے والا، مہربان ہے

۶. کچھ موارد ایسے ہیں جن میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسے نبی مکرم اسلام کے دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے لیے پیغمبر اسلام کی برزخ میں جائزہ لینا ضروری ہے. تو اس کے بارے میں کیا پیغمبر کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اسلام کی حیات برزخی کا تجزیہ کیا جائے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شہدا کے بارے میں قرآن کی صراحت موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اب جو شہدا کا پیغمبر ہے اس کی زندگی کا ثابت ہونا بطریق اولی ہے اور وہ بھی ایسی زندگی جو ان کی شایان شان ہو بلکہ قرآن کی مسلمات میں سے ہے کہ اس نے برزخی زندگی کو ثابت کیا ہے. لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

---

۱. بقرہ/ ۱۲۸

۲. یوسف/ ۹۸،۹۷

وآلہ کے لیے برزخی زندگی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی سیرت یہ رہی کہ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں بھی آپ سے متوسل ہوتے تھے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی متوسل ہوتے تھے اور ہیں اس کی چند مثالیں ہم یہاں ذکر کیے دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب عباسی خلیفہ منصور دوانقی مسجد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں زیارت میں مشغول تھا اور بلند آواز سے سلام اور دعا پڑھ رہا تھا تو اہل سنت کے امام مالک سے پوچھا:

''استقبل القبلۃ واد عوا ام استقبل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) واد عو''۔

کیا زیارت کے بعد قبلہ کا رخ کرکے خدا کو پکاروں یا رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منہ کرکے دعا کروں؟

امام مالک نے کہا: ''ولم تصرف وجھک عنہ وھو وسیلتک ووسیلۃ ابیک آدم الی اللہ تعالیٰ؟ بل استقبل واستشفع بہ فیشفعہ اللہ فیک''

پیغمبرؐ سے اپنا چہرہ کیوں موڑنا چاہتے ہو جب کہ وہ تو آپ اور آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں بلکہ قبر آنحضرت کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو اور ان سے شفاعت طلب کرو خداوند متعال ان کی شفاعت کو قبول کرتا ہے اس لئے کہ اس نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ ذْ ظَلَمُوا اَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا)[1]

ترجمہ: اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسولؐ بھی ان کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔[2]

جب مدینہ منورہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کی خبر پھیلی اور ابو بکر اس سے مطلع ہوئے تو اپنی رہائش گاہ سے نکلے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر پہنچے، مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات

---

[1]. سورۂ نساء: ۶۴۔

[2]. الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ۱: ۲۸۔

کئے بغیر سیدھے حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بدن مبارک ایک چادر میں لپٹا ہوا ہے بدن مبارک کے پاس بیٹھے اور چہرۂ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور اپنے کو اس پر گرا کر بوسے لیتے ہوئے گریہ کرنا شروع کیا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یا نبی اللہ! خدا نے آپ کے مقدر میں دوبار موت نہیں لکھی بلکہ ایک ہی بار لکھی تھی جو آگئی اور آپ اس دنیا سے گزر گئے۔ ''بابی انت یا نبی اللہ، لا یجمع اللہ علیک موتتین، اما الموتۃ التی کتبت علیک فقد متھا''.[1]

مفتی مکہ مکرمہ زینی دحلان نے اس حدیث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:

''قال ابو بکر: طبت حیا ومیتا، وانقطع بموتک مالم ینقطع للانبیاء قبلک، فعظمت عن الصفہ، وجللت عن البکاء، ولو ان موتک کان اختیارا لجدنا لموتک بالنفوس، اذکرنا یا محمد! عند ربک ولنکن علی بالک''.[2]

ابو بکر نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ کی زندگی و موت پاک و طاہر اور بابرکت تھی آپ کی موت سے وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا ہے۔ آپ کا مقام و منزلت اس قدر عظیم ہے کہ ناقابل توصیف ہے اور ہمیں رونے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر آپ کی موت ہمارے اختیار میں ہوتی تو ہم اپنی جانیں قربان کرکے آپ کو بچا لیتے۔ یا محمدؐ! اپنے رب کے پاس ہمیں یاد رکھنا اور ہمیں فراموش نہ کرنا۔

خلاصہ

۱. توسل کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں ہے.
۲. وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
۳. قرآن مجید مومنین کو خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے.
۴. بہترین وسیلہ جس کے ذریعہ لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں خدا اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء پر ایمان رکھنا ہے.

---

۱. صحیح بخاری ۷۰: ۲، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت ۵: ۱۴۳، کتاب المغازی، باب مرضی النبیؐ
۲. الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: ۳۴، طبع استنبول، سیرۂ زینی دحلان ۳: ۳۹۱، طبع مصر.

۵. خدا کی راہ میں جہاد کرنا، نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا اور باقی نیک اعمال کا بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

۶. اللہ تعالی کے اسماء اور صفات سے توسل کرنا چاہیے.

۷. قرآن مجید کی عظمت سے توسل کرنے کے بارے میں بھی حکم دیا گیا ہے.

۸. انسان اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا کی بارگاہ میں توسل کر سکتا ہے.

۹. انبیاء اور اولیاء سے توسل کرنے پر قرآن و حدیث میں متعدد دلائل پائے جاتے ہیں اور اسی طرح کئی تاریخی واقعات بھی اس بات پر شاہد ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

تئیسواں سبق

توسل

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد میں سے ایک توسل کا عقیدہ ہے اگرچہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد اس کا انکار کرتی ہے لیکن جب اس موضوع کو قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں اس کے متقن اور یقینی دلائل نظر آتے ہیں. پیش نظر سبق میں ہم توسل کا مفہوم بین کریں گے اور بتائیں گے کہ توسل سے ہماری مراد کیا ہے اس کے بعد توسل کی اقسام کا ذکر آئے گا، جہاں یہ بتایا جائے گا کہ کن چیزوں سے ذات پروردگار سے توسل کرنے میں سہارا لیا جاسکتا ہے. اور آخر میں اس موضوع کے کچھ سوال اور دلائل بھی بیان کیے جائیں گے. اگرچہ اس کی تفصیلی بحث کا مقام عقائد کی تفصیلی کتابیں ہی ہیں جہاں مدلل اور مبرہن بحثیں کی گئی ہیں.

تفصیل

لفظ توسل، مادہ "وسل" سے مشتق ہے اور یہ کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں آتا ہے. اور اسی لغوی معنی کے پیش نظر، وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
حدیث میں یوں ملتا ہے: "اللَّهُمَّ آتِ مُحَمَّداً صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَ آلِهِ الْوَسِيلَةَ وَ الرِّفْعَةَ وَ الْفَضِيلَةَ"[1]
اس سے مراد وہ مقام شفاعت ہے جو قیامت کے دن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا جائے گا.
قرآن مجید مؤمنین کو خدا کی قرابت حاصل کرنے کے لئے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ"[2]
اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت انسان کو خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلوں کی ضرورت ہے. جن کے نتیجے میں انسان کو قرب معنوی الہی حاصل ہوتا ہے.
اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وسیلہ کیا ہے.
نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ایک سو دس میں، قرب خدا کے حصول کے لئے اس وسیلہ کے بعض مصادیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "بہترین وسیلہ کہ جس کے ذریعے لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں، خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر پر ایمان رکھنا ہے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے، اسی طرح

---

[1]. التہذیب/ج ۴/ص ۸۲
[2]. مائدہ/۳۵

نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا، اور باقی نیک اعمال کو بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

توسل کی اقسام

شریعت مقدسہ میں بہت ساری چیزیں وارد ہوئی ہیں جن کے ذریعے بارگاہ خدا میں توسل کیا جا سکتا ہے، جن میں سے بعض چیزوں کی طرف حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی کلام میں اشارہ کیا گیا ہے.

۱. اللہ تعالی کی اسماء و صفات سے توسل کرنا.

قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے: ''وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا''[۱]

اسی بنا پر قرآن مجید اور سنت میں ذکر کیے گئے خدا کے ناموں کے ساتھ اس کی بارگاہ میں توسل کیا جا سکتا ہے، چاہے وہ نام صفات ذاتی سے حکایت کر رہا ہو، جیسے عالم، قادر، حی یا صفات فعل کو بیان کر رہا ہو، جیسے خالق، رازق یا پھر خداوند کی ذات سے ہر ایک عیب و نقص کی نفی کر رہا ہو جیسے قدوس، یا کمال الہی کو بیان کر رہا ہو، جیسے سمیع، بصیر و خبیر.

۲. قرآن مجید کی عظمت سے توسل، کیونکہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں قرآن کریم کا بہت عظیم مقام ہے. اسی کتاب میں توسل کے بارے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ پیغمبر اکرم کی سیرت اور آئمہ علیہم السلام کی زندگی میں اسی توسل کے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں . ان واقعات میں سے ایک واقعہ عریض بن عبداللہ سجستانی کا ہے اس واقعہ میں وہ امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا کہ شب قدر میں من جملہ مستحبات میں سے ایک مستحب یہ ہے کہ انسان قرآن کو اپنے سر پر رکھے اور خاص دعا کا ورد کرے، یہاں سے قرآن کے ساتھ تمسک کرنا سمجھ میں آتا ہے.

۳. انسان کا اپنے نیک اعمال کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں توسل کرنا یعنی جو بھی نیک اعمال انسان انجام دیتا ہے انہیں اپنے لیے وسیلہ قرار دے سکتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی تعمیر کے بعد اسی نیک کام کو

---

[۱]. اعراف/۱۸۰

اپنے لیے وسیلہ قرار دیا اور فرمایا: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.[1]

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر اور ہمیں ہماری عبادت کی حقیقت سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما، یقینا تو بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۴. اپنے مومن بھائی کی دعا کے ذریعہ توسل کرنا جیسے وہ مومن بھائی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے لیے دعا کرنا یہ بھی ایک قسم کا توسل ہے یعنی دوسروں کے لیے دعا کرنا بھی توسل کی اقسام میں سے ہے.

۵. کسی بھی پیغمبر کا اپنی حیات میں کسی دوسرے کے حق میں دعا کرنا جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں کا اپنے باپ سے کہنا کہ ہمارے لیے دعا کرو اور پھر حضرت یعقوب کا دعا کا وعدہ کرنا. اور اسی طرح پیغمبر گرامی اسلام کا اپنی امت کے لیے دعا کرنا. قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ. قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[2]

ترجمہ: بیٹوں نے کہا: اے ہمارے ابا! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے، ہم ہی خطاکار تھے۔ (یعقوب نے) کہا: عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا، وہ یقینا بڑا بخشنے والا، مہربان ہے

۶. کچھ موارد ایسے ہیں جن میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسے نبی مکرم اسلام کے دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے لیے پیغمبر اسلام کی برزخ میں جائزہ لینا ضروری ہے. تو اس کے بارے میں کیا پیغمبر کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اسلام کی حیات برزخی کا تجزیہ کیا جائے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شہدا کے بارے میں قرآن کی صراحت موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اب جو شہدا کا پیغمبر ہے اس کی زندگی کا ثابت ہونا بطریق اولی ہے اور وہ بھی ایسی زندگی جو ان کی شایان شان ہو بلکہ قرآن کی مسلمات میں سے ہے کہ اس نے برزخی زندگی کو ثابت کیا ہے. لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

---

۱. بقرہ/ ۱۲۸

۲. یوسف/ ۹۸،۹۷

وآلہ کے لیے برزخی زندگی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی سیرت یہ رہی کہ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں بھی آپ سے متوسل ہوتے تھے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی متوسل ہوتے تھے اور ہیں اس کی چند مثالیں ہم یہاں ذکر کیے دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب عباسی خلیفہ منصور دوانقی مسجد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں زیارت میں مشغول تھا اور بلند آواز سے سلام اور دعا پڑھ رہا تھا تو اہل سنت کے امام مالک سے پوچھا:

''استقبل القبلۃ واد عوا ام استقبل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) واد عو''۔

کیا زیارت کے بعد قبلہ کا رخ کرکے خدا کو پکاروں یا رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منہ کرکے دعا کروں؟

امام مالک نے کہا: ''ولم تصرف وجھک عنہ وھو وسیلتک ووسیلۃ ابیک آدم الی اللہ تعالیٰ؟ بل استقبل واستشفع بہ فیشفعہ اللہ فیک''

پیغمبرؐ سے اپنا چہرہ کیوں موڑنا چاہتے ہو جب کہ وہ تو آپ اور آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں بلکہ قبر آنحضرت کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو اور ان سے شفاعت طلب کرو خداوند متعال ان کی شفاعت کو قبول کرتا ہے اس لئے کہ اس نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ ذْ ظَلَمُوا اَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا)[1]

ترجمہ: اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسولؐ بھی ان کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔[2]

جب مدینہ منورہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کی خبر پھیلی اور ابو بکر اس سے مطلع ہوئے تو اپنی رہائش گاہ سے نکلے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر پہنچے، مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات

---

[1]. سورۂ نساء: ۶۴۔

[2]. الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ۱: ۲۸۔

کئے بغیر سیدھے حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بدن مبارک ایک چادر میں لپٹا ہوا ہے بدن مبارک کے پاس بیٹھے اور چہرۂ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور اپنے کو اس پر گرا کر بوسے لیتے ہوئے گریہ کرنا شروع کیا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یا نبی اللہ! خدا نے آپ کے مقدر میں دوبار موت نہیں لکھی بلکہ ایک ہی بار لکھی تھی جو آگئی اور آپ اس دنیا سے گزر گئے۔ ''بابی انت یا نبی اللہ، لا یجمع اللہ علیک موتتین، اما الموتۃ التی کتبت علیک فقد متھا''.[1]

مفتی مکہ مکرمہ زینی دحلان نے اس حدیث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:

''قال ابو بکر: طبت حیا ومیتا، وانقطع بموتک مالم ینقطع للانبیاء قبلک، فعظمت عن الصفہ، وجللت عن البکاء، ولو ان موتک کان اختیارا لجدنا لموتک بالنفوس، اذکرنا یا محمد! عند ربک ولنکن علی بالک''.[2]

ابو بکر نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ کی زندگی و موت پاک و طاہر اور بابرکت تھی آپ کی موت سے وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا ہے۔ آپ کا مقام و منزلت اس قدر عظیم ہے کہ ناقابل توصیف ہے اور ہمیں رونے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر آپ کی موت ہمارے اختیار میں ہوتی تو ہم اپنی جانیں قربان کرکے آپ کو بچا لیتے۔ یا محمدؐ! اپنے رب کے پاس ہمیں یاد رکھنا اور ہمیں فراموش نہ کرنا۔

خلاصہ

۱. توسل کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں ہے.
۲. وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
۳. قرآن مجید مومنین کو خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے.
۴. بہترین وسیلہ جس کے ذریعہ لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں خدا اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء پر ایمان رکھنا ہے.

---

۱. صحیح بخاری ۷۰: ۲، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت ۵: ۱۴۳، کتاب المغازی، باب مرضی النبیؐ
۲. الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: ۳۴، طبع استنبول، سیرۂ زینی دحلان ۳: ۳۹۱، طبع مصر.

۵. خدا کی راہ میں جہاد کرنا، نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا اور باقی نیک اعمال کا بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

۶. اللہ تعالی کے اسماء اور صفات سے توسل کرنا چاہیے.

۷. قرآن مجید کی عظمت سے توسل کرنے کے بارے میں بھی حکم دیا گیا ہے.

۸. انسان اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا کی بارگاہ میں توسل کر سکتا ہے.

۹. انبیاء اور اولیاء سے توسل کرنے پر قرآن و حدیث میں متعدد دلائل پائے جاتے ہیں اور اسی طرح کئی تاریخی واقعات بھی اس بات پر شاہد ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چوبیسواں سبق

توسل

بیچلر B.A

تمہید

اسلام کے مسلمہ عقائد میں سے ایک توسل کا عقیدہ ہے اگرچہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد اس کا انکار کرتی ہے لیکن جب اس موضوع کو قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں اس کے متقن اور یقینی دلائل نظر آتے ہیں. پیش نظر سبق میں ہم توسل کا مفہوم بین کریں گے اور بتائیں گے کہ توسل سے ہماری مراد کیا ہے اس کے بعد توسل کی اقسام کا ذکر آئے گا، جہاں یہ بتایا جائے گا کہ کن چیزوں سے ذات پروردگار سے توسل کرنے میں سہارا لیا جاسکتا ہے. اور آخر میں اس موضوع کے کچھ سوال اور دلائل بھی بیان کیے جائیں گے. اگرچہ اس کی تفصیلی بحث کا مقام عقائد کی تفصیلی کتابیں ہی ہیں جہاں مدلل اور مبرہن بحثیں کی گئی ہیں.

تفصیل

لفظ توسل، مادہ "وسل" سے مشتق ہے اور یہ کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں آتا ہے. اور اسی لغوی معنی کے پیش نظر، وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
حدیث میں یوں ملتا ہے: "اللَّهُمَّ آتِ مُحَمَّداً صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَ آلِهِ الْوَسِيلَةَ وَ الرِّفْعَةَ وَ الْفَضِيلَةَ"[1]
اس سے مراد وہ مقام شفاعت ہے جو قیامت کے دن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا جائے گا.
قرآن مجید مؤمنین کو خدا کی قرابت حاصل کرنے کے لئے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ"[2]
اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت انسان کو خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلوں کی ضرورت ہے. جن کے نتیجے میں انسان کو قرب معنوی الہی حاصل ہوتا ہے.
اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وسیلہ کیا ہے.
نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ایک سو دس میں، قرب خدا کے حصول کے لئے اس وسیلہ کے بعض مصادیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "بہترین وسیلہ کہ جس کے ذریعے لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں، خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر پر ایمان رکھنا ہے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے، اسی طرح

---

[1]. التہذیب/ج ۴/ص ۸۲
[2]. مائدہ/۳۵

نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا، اور باقی نیک اعمال کو بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

توسل کی اقسام

شریعت مقدسہ میں بہت ساری چیزیں وارد ہوئی ہیں جن کے ذریعے بارگاہ خدا میں توسل کیا جا سکتا ہے، جن میں سے بعض چیزوں کی طرف حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی کلام میں اشارہ کیا گیا ہے.

۱. اللہ تعالی کی اسماء و صفات سے توسل کرنا.

قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے: ''وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا''[۱]

اسی بنا پر قرآن مجید اور سنت میں ذکر کیے گئے خدا کے ناموں کے ساتھ اس کی بارگاہ میں توسل کیا جا سکتا ہے، چاہے وہ نام صفات ذاتی سے حکایت کر رہا ہو، جیسے عالم، قادر، حی یا صفات فعل کو بیان کر رہا ہو، جیسے خالق، رازق یا پھر خداوند کی ذات سے ہر ایک عیب و نقص کی نفی کر رہا ہو جیسے قدوس، یا کمال الہی کو بیان کر رہا ہو، جیسے سمیع، بصیر و خبیر.

۲. قرآن مجید کی عظمت سے توسل، کیونکہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں قرآن کریم کا بہت عظیم مقام ہے. اسی کتاب میں توسل کے بارے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ پیغمبر اکرم کی سیرت اور آئمہ علیہم السلام کی زندگی میں اسی توسل کے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں . ان واقعات میں سے ایک واقعہ عریض بن عبداللہ سجستانی کا ہے اس واقعہ میں وہ امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا کہ شب قدر میں من جملہ مستحبات میں سے ایک مستحب یہ ہے کہ انسان قرآن کو اپنے سر پر رکھے اور خاص دعا کا ورد کرے، یہاں سے قرآن کے ساتھ تمسک کرنا سمجھ میں آتا ہے.

۳. انسان کا اپنے نیک اعمال کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں توسل کرنا یعنی جو بھی نیک اعمال انسان انجام دیتا ہے انہیں اپنے لیے وسیلہ قرار دے سکتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی تعمیر کے بعد اسی نیک کام کو

---

[۱]. اعراف/۱۸۰

اپنے لیے وسیلہ قرار دیا اور فرمایا: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.[1]

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر اور ہمیں ہماری عبادت کی حقیقت سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما، یقینا تو بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۴. اپنے مومن بھائی کی دعا کے ذریعہ توسل کرنا جیسے وہ مومن بھائی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے لیے دعا کرنا یہ بھی ایک قسم کا توسل ہے یعنی دوسروں کے لیے دعا کرنا بھی توسل کی اقسام میں سے ہے.

۵. کسی بھی پیغمبر کا اپنی حیات میں کسی دوسرے کے حق میں دعا کرنا جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں کا اپنے باپ سے کہنا کہ ہمارے لیے دعا کرو اور پھر حضرت یعقوب کا دعا کا وعدہ کرنا. اور اسی طرح پیغمبر گرامی اسلام کا اپنی امت کے لیے دعا کرنا. قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ. قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[2]

ترجمہ: بیٹوں نے کہا: اے ہمارے ابا! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے، ہم ہی خطاکار تھے۔ (یعقوب نے) کہا: عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا، وہ یقینا بڑا بخشنے والا، مہربان ہے

۶. کچھ موارد ایسے ہیں جن میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسے نبی مکرم اسلام کے دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے لیے پیغمبر اسلام کی برزخ میں جائزہ لینا ضروری ہے. تو اس کے بارے میں کیا پیغمبر کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اسلام کی حیات برزخی کا تجزیہ کیا جائے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شہدا کے بارے میں قرآن کی صراحت موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اب جو شہدا کا پیغمبر ہے اس کی زندگی کا ثابت ہونا بطریق اولی ہے اور وہ بھی ایسی زندگی جو ان کی شایان شان ہو بلکہ قرآن کی مسلمات میں سے ہے کہ اس نے برزخی زندگی کو ثابت کیا ہے. لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

---

۱. بقرہ/ ۱۲۸

۲. یوسف/ ۹۸،۹۷

وآلہ کے لیے برزخی زندگی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی سیرت یہ رہی کہ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں بھی آپ سے متوسل ہوتے تھے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی متوسل ہوتے تھے اور ہیں اس کی چند مثالیں ہم یہاں ذکر کیے دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب عباسی خلیفہ منصور دوانقی مسجد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں زیارت میں مشغول تھا اور بلند آواز سے سلام اور دعا پڑھ رہا تھا تو اہل سنت کے امام مالک سے پوچھا:

''استقبل القبلۃ واد عوا ام استقبل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) واد عو''۔

کیا زیارت کے بعد قبلہ کا رخ کرکے خدا کو پکاروں یا رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منہ کرکے دعا کروں؟

امام مالک نے کہا: ''ولم تصرف وجھک عنہ وھو وسیلتک ووسیلۃ ابیک آدم الی اللہ تعالیٰ؟ بل استقبل واستشفع بہ فیشفعہ اللہ فیک''

پیغمبرؐ سے اپنا چہرہ کیوں موڑنا چاہتے ہو جب کہ وہ تو آپ اور آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں بلکہ قبر آنحضرت کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو اور ان سے شفاعت طلب کرو خداوند متعال ان کی شفاعت کو قبول کرتا ہے اس لئے کہ اس نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ ذْ ظَلَمُوا اَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا)[1]

ترجمہ: اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسولؐ بھی ان کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔[2]

جب مدینہ منورہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کی خبر پھیلی اور ابو بکر اس سے مطلع ہوئے تو اپنی رہائش گاہ سے نکلے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر پہنچے، مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات

---

[1]. سورۂ نساء: ۶۴۔

[2]. الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ۱: ۲۸۔

کئے بغیر سیدھے حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بدن مبارک ایک چادر میں لپٹا ہوا ہے بدن مبارک کے پاس بیٹھے اور چہرۂ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور اپنے کو اس پر گرا کر بوسے لیتے ہوئے گریہ کرنا شروع کیا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یا نبی اللہ! خدا نے آپ کے مقدر میں دوبار موت نہیں لکھی بلکہ ایک ہی بار لکھی تھی جو آگئی اور آپ اس دنیا سے گزر گئے۔ ''بابی انت یا نبی اللہ، لا یجمع اللہ علیک موتتین، اما الموتۃ التی کتبت علیک فقد متھا''.[1]

مفتی مکہ مکرمہ زینی دحلان نے اس حدیث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:

''قال ابو بکر: طبت حیا ومیتا، وانقطع بموتک مالم ینقطع للانبیاء قبلک، فعظمت عن الصفہ، وجللت عن البکاء، ولو ان موتک کان اختیارا لجدنا لموتک بالنفوس، اذکرنا یا محمد! عند ربک ولنکن علی بالک''.[2]

ابو بکر نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ کی زندگی و موت پاک و طاہر اور بابرکت تھی آپ کی موت سے وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا ہے۔ آپ کا مقام و منزلت اس قدر عظیم ہے کہ ناقابل توصیف ہے اور ہمیں رونے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر آپ کی موت ہمارے اختیار میں ہوتی تو ہم اپنی جانیں قربان کرکے آپ کو بچا لیتے۔ یا محمدؐ! اپنے رب کے پاس ہمیں یاد رکھنا اور ہمیں فراموش نہ کرنا۔

خلاصہ

۱. توسل کسی ذات یا شخص کا تقرب حاصل کرنے کے معنی میں ہے.
۲. وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کسی دوسری ذات کا تقرب حاصل کرتا ہے.
۳. قرآن مجید مومنین کو خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے وسیلہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے.
۴. بہترین وسیلہ جس کے ذریعہ لوگ قرب خدا کو حاصل کر سکتے ہیں خدا اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء پر ایمان رکھنا ہے.

---

۱. صحیح بخاری ۷۰: ۲، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت ۵: ۱۴۳، کتاب المغازی، باب مرضی النبیؐ
۲. الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: ۳۴، طبع استنبول، سیرۂ زینی دحلان ۳: ۳۹۱، طبع مصر.

۵. خدا کی راہ میں جہاد کرنا، نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا اور باقی نیک اعمال کا بجالانا، یہی سب خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے وسیلے ہیں.

۶. اللہ تعالی کے اسماء اور صفات سے توسل کرنا چاہیے.

۷. قرآن مجید کی عظمت سے توسل کرنے کے بارے میں بھی حکم دیا گیا ہے.

۸. انسان اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا کی بارگاہ میں توسل کر سکتا ہے.

۹. انبیاء اور اولیاء سے توسل کرنے پر قرآن و حدیث میں متعدد دلائل پائے جاتے ہیں اور اسی طرح کئی تاریخی واقعات بھی اس بات پر شاہد ہیں.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

پچیسواں سبق

توسل

بیچلر B.A

تمہید

اس سبق میں بھی گذشتہ سبق کی طرح توسل کے ہی سلسلہ بحث کو آگے بڑھایا جائے گا. اس میں ہم جن اہم نکات کو بیان کرنا چاہتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اور ان کی برزخی زندگی میں ان سے توسل کیا جاسکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ بیان کی جائے گی کہ توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی کیا شرائط ہیں اور اسی بات کو روایات اور تاریخی واقعات کی روشنی میں بیان کیا جائے گا.

تفصیل

کیا پیغمبر کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟
تو اس کے جواب میں ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اسلام کی حیات برزخی کا تجزیہ کیا جائے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شہدا کے بارے میں قرآن کی صراحت موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اب جو شہدا کا پیغمبر ہے اس کی زندگی کا ثابت ہونا بطریق اولی ہے اور وہ بھی ایسی زندگی جو ان کی شایان شان ہو.
ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اللہ کے نیک بندوں کی دعا سے توسل کرنا اس صورت میں عین توحید ہے کہ جس سے توسل کرتے ہیں، وہ زندہ بھی ہو، لیکن اس وقت جبکہ انبیاء و اولیاء دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان سے توسل کس طرح مفید اور عین توحید ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:
الف) اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ نبی یا ولی خدا سے توسل کی شرط ان کی حیات ہے، تو اس صورت میں انبیاء و اولیاء سے ان کے مرنے کے بعد توسل کرنا صرف ایک بے فائدہ کام ہوگا، شرک کا سبب نہ ہوگا. اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس سے اکثر و بیشتر غفلت برتی گئی ہے. اور تصور کیا گیا ہے کہ موت و حیات، شرک و توحید کی سرحد ہے جبکہ ایسے مفروضہ کو قبول کرنے کی صورت میں (یعنی لوگوں کا انبیاء و اولیاء علیہم السلام کی زندگی میں ان سے توسل کرنا) نبی یا ولی کا زندہ ہونا توسل کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار تو ہوگا، توحید و شرک کی سرحد نہیں ہو سکتا اور نہ یہ عمل شرک آمیز ہو سکتا ہے.
ب) توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی صرف دو شرطیں ہیں:

۱. جس شخص سے توسل کیا جاتا ہے صاحب علم و شعور اور صاحب قدرت ہو.
۲. توسل چاہنے والے اور اس کے درمیان رابطہ برقرار ہو.

انبیاء اور اولیاء الٰہی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان سے توسل میں مذکور دونوں شرائط (یعنی ادراک و شعور و علم نیز ہمارے اور ان کے درمیان رابطے کا وجود) پائے جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں واضح اور ناقابل انکار عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔

برزخی زندگی کا وجود قرآن کے روشن اور یقینی مسائل میں سے ہے۔ قرآن کے صریح اور ناقابل انکار حکم کے مطابق راہ حق میں شہید ہونے والے حیات و زندگی کے مالک ہیں، تو یقیناً انبیاء اور اولیاء الٰہی جن میں سے بہت سے شہید بھی ہوئے ہیں، بہتر زندگی کے مالک ہوں گے۔

ہمارے اور اولیاء الٰہی کے درمیان رابطے کے وجود کے سلسلے میں بہت سے دلائل موجود ہیں جن میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱. تمام مسلمان نماز کے اختتام پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: السلام علیک ایھاالنبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کیا اس طرح مسلمان حقیقت میں ایک بیہودہ کام انجام دیتے ہیں، اور کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام سلاموں کو نہیں سنتے اور جواب نہیں دیتے؟

۲. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر میں حکم دیا کہ مشرکین کے اجساد کو جمع کر کے ایک گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اجساد سے مخاطب ہوئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے سوال کیا: کیا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مردوں سے باتیں کر رہے ہیں؟ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ان سے بہتر نہیں سنتے۔[1]

۳. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان بقیع تشریف لے جاتے تھے اور قبرستان میں سوئی ہوئی ارواح سے یوں خطاب فرماتے تھے: السلام علی اہل الدیار من المومنین والمومنات۔

پس توسل ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس بہت دلائل موجود ہیں اور اس کی مختلف صورتیں ہیں، جن کی تفصیلی بحث عقائد کی تفصیل کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔

---

[1]. صحیح بخاری، ج۵، باب قتل ابی جہل، سیرہ ابن ہشام، ج۲، ص ۲۹۲، وغیرہ

بعثت سے پہلے پیغمبر اسلام سے توسل کرنا

اہل سنت کے معروف عالم شہرستانی اپنی کتاب ملل و نحل میں لکھتے ہیں :

جب سرزمین مکہ کو قحط نے اپنی لپیٹ میں لیا اور بادلوں نے برسنے سے انکار کر دیا تو اہل مکہ کے لئے زندگی کرنا ناگزیر ہو گیا۔ جناب عبد المطلب نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ہاتھوں پر لیا اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا :

"یارب !بحق هذا الغلام ورماه ثانیا وثالثا وکان یقول : بحق هذا الغلام اسقنا غیثا ، مغیثا، دائما، هاطلا ، فلم یلبث ساعة ان طبق السحاب وجه السماء ، وامطر حتی خافوا علی المسجد ".[1]

خدایا اس بچے کا واسطہ اپنی رحمت کا نزول فرما: ابھی تھوری ہی دیر گذری تھی کہ مکہ پر بادل چھانے لگے اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ ڈر گئے کہ کہیں خانہ کعبہ سیلاب میں ہی نہ بہہ جائے۔

ابن حجر کہتا ہے :

جب عبد المطلب نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا واسطہ دے کر بارش طلب کی تو سرداران مکہ عبد اللہ بن جدعان اور حرب بن امیہ حضرت عبد المطلب کے پاس آئے اور کہنے لگی : ''هنیئاً لک ! ابا البطحاء '' [2] اے حجاز کے باپ تجھے یہ بچہ مبارک ہو۔

اسی طرح ابن حجر یہ بھی لکھتا ہے : ابو طالب کا یہ شعر اسی داستان سے متعلق ہے :

وابیض یستسقی الغمام بوجهه

نمال الیتامی عصمة للارامل [3]

وہ سفید چہرے والے جس کے صدقے میں بادل یتیموں، بیواؤں اور بے چاروں پر رحمت برساتے ہیں.

---

[1]. الملل والنحل ۲: ۲۴۹.

[2]. الاصابة فی تمییز الصحابة ۸: ۱۳۶، ترجمہ رقیقة بنت ابی صیفی بن ہاشم.

[3]. فتح الباری ۲: ۴۱۲ و دلائل النبوة ۲: ۱۲۶.

۳۔ جناب ابو طالب کا آنحضرت کے بچپن میں ان سے توسل

ابن عساکر اور دیگر نے ابو عرفہ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے :

جب مکہ پر قحط سالی چھائی تو لوگ ابو طالب کے پاس جمع ہوئے اور ان سے کہنے لگے :اب پورے مکہ پر قحط طاری ہو چکا ہے لوگوں کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے خدا سے رحمت طلب کریں !

ابو طالب نے ایک چھوٹے سے بچے کو ہمراہ لیا جو وہی پیغمبر گرامیؐ تھے آفتاب کی مانند چمکتے ہوئے بچوں کے حلقے میں باہر نکلے خانہ کعبہ کے پاس پہنچے اور رسول خداؐ کا واسطہ دے کر باران رحمت طلب کی۔ یہاں تک کہ بادل اکٹھے ہوئے اور بارش برسنے لگی جس سے صحراؤں میں بھی پانی جمع ہو گیا۔ اس وقت ابو طالب نے اپنا مشہور شعر پڑھا:

وابیض یستسقی الغمام بوجه

ثمال الیتامی عصمة للارامل [۱]

اور اس سے بڑھ کر اس بات پر سیرہ مسلمین بھی قائم ہے . جیسے بخاری نے اپنی کتاب میں یوں لکھا ہے : صحیح بخاری میں انس سے نقل ہوا ہے :

جب کبھی قحط پڑتا تو عمر بن خطاب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا حضرت عباس سے متوسل ہوتے اور کہتے : **"اللهم انا کنا نتوسل الیک بنبینا فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون"** [۲]

خدایا! تیرے پیغمبر کے زمانہ میں ہم ان کو واسطہ قرار دیتے تو تو باران رحمت نازل فرمایا کرتا اور اب ہم پیغمبرؐ کے چچا کو وسیلہ بنا رہے ہیں تو ہم پر اپنی رحمت کا نزول فرما۔ اسی وقت بارش برسنا شروع ہو گئی۔

پس ان سب واقعات اور روایات سے معلوم ہوا کہ اولیاء سے توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ کام ہم اپنی مرضی سے نہیں کرتے بلکہ خود خدا نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اور اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے لائق بندوں کا تعارف کروانا چاہتا ہے اور پھر ان کے مقام تک رسائی کی ترغیب کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ کہ اس کام کی دیگر حکمت یہ ہے کہ انسان کہیں مغرور نہ ہو جائے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے علاوہ بھی بہت ہی عظیم ہستیاں موجود ہیں جو ان عظیم مقامات پر فائز ہیں .

---

[۱]. مختصر تاریخ دمشق . ابن منظور . ۱: ۱۶۲ خصائص الکبریٰ سیوطی ۱: ۸۶ وسیرہ نبویہ زینی دحلان ۱: ۴۳.

[۲].) صحیح بخاری ۱۰۱۰۱۶: ۲، کتاب الاستسقاء ، باب سوال الناس الامام استسقاء اذا قحطوا.

خلاصہ

۱. نبی یا ولی خدا سے توسل کی شرط ان کی حیات نہیں ہے.
۲. نبی یا ولی کا زندہ ہونا توسل کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار ہے لیکن توحید و شرک کی سرحد نہیں ہے.
۳. انبیاء یا اولیاء سے توسل کرنا شرک نہیں ہے.
۴. توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی دو شرطیں ہیں.
۵. جس شخص سے توسل کیا جاتا ہے اسے صاحب علم و شعور اور صاحب قدرت ہونا چاہیے.
۶. توسل چاہنے والے اور اسکے درمیان رابطہ برقرار ہونا چاہیے.
۷. انبیاء اور اولیاء الٰہی میں توسل کی شرائط پائی جاتی ہیں.
۸. بعثت سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگ توسل کیا کرتے تھے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چھبیسواں سبق

توسل

بیچلر B.A

تمہید

اس سبق میں بھی گذشتہ سبق کی طرح توسل کے ہی سلسلہ بحث کو آگے بڑھایا جائے گا. اس میں ہم جن اہم نکات کو بیان کرنا چاہتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اور ان کی برزخی زندگی میں ان سے توسل کیا جاسکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ بیان کی جائے گی کہ توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی کیا شرائط ہیں اور اسی بات کو روایات اور تاریخی واقعات کی روشنی میں بیان کیا جائے گا.

تفصیل

کیا پیغمبر کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان سے توسل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟
تو اس کے جواب میں ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اسلام کی حیات برزخی کا تجزیہ کیا جائے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شہدا کے بارے میں قرآن کی صراحت موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اب جو شہدا کا پیغمبر ہے اس کی زندگی کا ثابت ہونا بطریق اولی ہے اور وہ بھی ایسی زندگی جو ان کی شایان شان ہو.
ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اللہ کے نیک بندوں کی دعا سے توسل کرنا اس صورت میں عین توحید ہے کہ جس سے توسل کرتے ہیں، وہ زندہ بھی ہو، لیکن اس وقت جبکہ انبیاء و اولیاء دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان سے توسل کس طرح مفید اور عین توحید ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:
الف) اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ نبی یا ولی خدا سے توسل کی شرط ان کی حیات ہے، تو اس صورت میں انبیاء و اولیاء سے ان کے مرنے کے بعد توسل کرنا صرف ایک بے فائدہ کام ہوگا، شرک کا سبب نہ ہوگا. اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس سے اکثر و بیشتر غفلت برتی گئی ہے. اور تصور کیا گیا ہے کہ موت و حیات، شرک و توحید کی سرحد ہے جبکہ ایسے مفروضہ کو قبول کرنے کی صورت میں (یعنی لوگوں کا انبیاء و اولیاء علیہم السلام کی زندگی میں ان سے توسل کرنا) نبی یا ولی کا زندہ ہونا توسل کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار تو ہوگا، توحید و شرک کی سرحد نہیں ہو سکتا اور نہ یہ عمل شرک آمیز ہو سکتا ہے.
ب) توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی صرف دو شرطیں ہیں:

۱. جس شخص سے توسل کیا جاتا ہے صاحب علم و شعور اور صاحب قدرت ہو.
۲. توسل چاہنے والے اور اس کے درمیان رابطہ برقرار ہو.

انبیاء اور اولیاء الٰہی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان سے توسل میں مذکور دونوں شرائط (یعنی ادراک و شعور و علم نیز ہمارے اور ان کے درمیان رابطے کا وجود) پائے جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں واضح اور ناقابل انکار عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔

برزخی زندگی کا وجود قرآن کے روشن اور یقینی مسائل میں سے ہے۔ قرآن کے صریح اور ناقابل انکار حکم کے مطابق راہ حق میں شہید ہونے والے حیات و زندگی کے مالک ہیں، تو یقیناً انبیاء اور اولیاء الٰہی جن میں سے بہت سے شہید بھی ہوئے ہیں، بہتر زندگی کے مالک ہوں گے۔

ہمارے اور اولیاء الٰہی کے درمیان رابطے کے وجود کے سلسلے میں بہت سے دلائل موجود ہیں جن میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱. تمام مسلمان نماز کے اختتام پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: السلام علیک ایھاالنبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کیا اس طرح مسلمان حقیقت میں ایک بیہودہ کام انجام دیتے ہیں، اور کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام سلاموں کو نہیں سنتے اور جواب نہیں دیتے؟

۲. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر میں حکم دیا کہ مشرکین کے اجساد کو جمع کر کے ایک گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اجساد سے مخاطب ہوئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے سوال کیا: کیا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مردوں سے باتیں کر رہے ہیں؟ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ان سے بہتر نہیں سنتے۔[1]

۳. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان بقیع تشریف لے جاتے تھے اور قبرستان میں سوئی ہوئی ارواح سے یوں خطاب فرماتے تھے: السلام علی اہل الدیار من المومنین والمومنات۔

پس توسل ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس بہت دلائل موجود ہیں اور اس کی مختلف صورتیں ہیں، جن کی تفصیلی بحث عقائد کی تفصیل کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔

---

[1]. صحیح بخاری، ج۵، باب قتل ابی جہل، سیرہ ابن ہشام، ج۲، ص ۲۹۲، وغیرہ

بعثت سے پہلے پیغمبر اسلام سے توسل کرنا

اہل سنت کے معروف عالم شہرستانی اپنی کتاب ملل و نحل میں لکھتے ہیں :

جب سرزمین مکہ کو قحط نے اپنی لپیٹ میں لیا اور بادلوں نے برسنے سے انکار کر دیا تو اہل مکہ کے لئے زندگی کرنا ناگزیر ہو گیا۔ جناب عبد المطلب نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ہاتھوں پر لیا اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا :

"یارب !بحق هذا الغلام ورماه ثانیا وثالثا وکان یقول : بحق هذا الغلام اسقنا غیثا ، مغیثا، دائما، هاطلا ، فلم یلبث ساعة ان طبق السحاب وجه السماء ، وامطر حتی خافوا علی المسجد ".[1]

خدایا اس بچے کا واسطہ اپنی رحمت کا نزول فرما: ابھی تھوری ہی دیر گذری تھی کہ مکہ پر بادل چھانے لگے اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ ڈر گئے کہ کہیں خانہ کعبہ سیلاب میں ہی نہ بہہ جائے۔

ابن حجر کہتا ہے :

جب عبد المطلب نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا واسطہ دے کر بارش طلب کی تو سرداران مکہ عبد اللہ بن جدعان اور حرب بن امیہ حضرت عبد المطلب کے پاس آئے اور کہنے لگی : ''هنیئاً لک ! ابا البطحاء '' [2] اے حجاز کے باپ تجھے یہ بچہ مبارک ہو۔

اسی طرح ابن حجر یہ بھی لکھتا ہے : ابو طالب کا یہ شعر اسی داستان سے متعلق ہے :

وابیض یستسقی الغمام بوجهه
نمال الیتامی عصمة للارامل [3]

وہ سفید چہرے والے جس کے صدقے میں بادل یتیموں، بیواؤں اور بے چاروں پر رحمت برساتے ہیں.

---

[1]. الملل والنحل ۲: ۲۴۹.

[2]. الاصابة فی تمییز الصحابة ۸: ۱۳۶، ترجمہ رقیقة بنت ابی صیفی بن ہاشم.

[3]. فتح الباری ۲: ۴۱۲ و دلائل النبوة ۲: ۱۲۶.

۳۔ جناب ابو طالب کا آنحضرت کے بچپن میں ان سے توسل

ابن عساکر اور دیگر نے ابو عرفہ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے :

جب مکہ پر قحط سالی چھائی تو لوگ ابو طالب کے پاس جمع ہوئے اور ان سے کہنے لگے :اب پورے مکہ پر قحط طاری ہو چکا ہے لوگوں کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے خدا سے رحمت طلب کریں !

ابو طالب نے ایک چھوٹے سے بچے کو ہمراہ لیا جو وہی پیغمبر گرامیؐ تھے آفتاب کی مانند چمکتے ہوئے بچوں کے حلقے میں باہر نکلے خانہ کعبہ کے پاس پہنچے اور رسول خداؐ کا واسطہ دے کر باران رحمت طلب کی۔ یہاں تک کہ بادل اکٹھے ہوئے اور بارش برسنے لگی جس سے صحراؤں میں بھی پانی جمع ہو گیا۔ اس وقت ابو طالب نے اپنا مشہور شعر پڑھا:

وابیض یستسقی الغمام بوجه

ثمال الیتامی عصمة للارامل [۱]

اور اس سے بڑھ کر اس بات پر سیرہ مسلمین بھی قائم ہے . جیسے بخاری نے اپنی کتاب میں یوں لکھا ہے : صحیح بخاری میں انس سے نقل ہوا ہے :

جب کبھی قحط پڑتا تو عمر بن خطاب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا حضرت عباس سے متوسل ہوتے اور کہتے : **"اللهم انا کنا نتوسل الیک بنبینا فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون"** [۲]

خدایا! تیرے پیغمبر کے زمانہ میں ہم ان کو واسطہ قرار دیتے تو تو باران رحمت نازل فرمایا کرتا اور اب ہم پیغمبرؐ کے چچا کو وسیلہ بنا رہے ہیں تو ہم پر اپنی رحمت کا نزول فرما۔ اسی وقت بارش برسنا شروع ہو گئی۔

پس ان سب واقعات اور روایات سے معلوم ہوا کہ اولیاء سے توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ کام ہم اپنی مرضی سے نہیں کرتے بلکہ خود خدا نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اور اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے لائق بندوں کا تعارف کروانا چاہتا ہے اور پھر ان کے مقام تک رسائی کی ترغیب کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ کہ اس کام کی دیگر حکمت یہ ہے کہ انسان کہیں مغرور نہ ہو جائے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے علاوہ بھی بہت ہی عظیم ہستیاں موجود ہیں جو ان عظیم مقامات پر فائز ہیں .

---

[۱]. مختصر تاریخ دمشق . ابن منظور . ۱: ۱۶۲ خصائص الکبریٰ سیوطی ۱: ۸۶ وسیرہ نبویہ زینی دحلان ۱: ۴۳.

[۲].) صحیح بخاری ۱۰۱۰۱۶: ۲، کتاب الاستسقاء ، باب سوال الناس الامام استسقاء اذا قحطوا.

خلاصہ

۱. نبی یا ولی خدا سے توسل کی شرط ان کی حیات نہیں ہے.
۲. نبی یا ولی کا زندہ ہونا توسل کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار ہے لیکن توحید و شرک کی سرحد نہیں ہے.
۳. انبیاء یا اولیاء سے توسل کرنا شرک نہیں ہے.
۴. توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی دو شرطیں ہیں.
۵. جس شخص سے توسل کیا جاتا ہے اسے صاحب علم و شعور اور صاحب قدرت ہونا چاہیے.
۶. توسل چاہنے والے اور اسکے درمیان رابطہ برقرار ہونا چاہیے.
۷. انبیاء اور اولیاء الٰہی میں توسل کی شرائط پائی جاتی ہیں.
۸. بعثت سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگ توسل کیا کرتے تھے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

ستائیسواں سبق

جبر واختیار

بیچلر B.A

تمہید

جبر واختیار ایک کلامی بحث ہے جو عدل الٰہی سے مربوط ہے. کچھ لوگوں نے جبر واختیار کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے انہوں نے آیات الٰہی کے بر خلاف اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کے انسان کے تمام افعال کا ذمہ دار اللہ کو ٹھہرایا گیا اور انسان سے فاعلیت کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی ہے. لہٰذا کوئی بھی شخص اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا اور انسان اپنے تمام افعال میں مجبور ہے اسی نکتہ کی ہم اس سبق میں وضاحت کریں گے .

تفصیل

گزشتہ درسوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود میں ذات واجب الوجود یعنی خدائے یکیا کے محتاج ہیں، اسی طرح اپنے افعال میں بھی اسی ذات کے محتاج ہیں. یعنی موجودات عالم سے صادر ہونے والے افعال میں مؤثر حقیقی ذات واجب الوجود ہے. علم کلام کی اصطلاح میں اسی معنی اور مفہوم کو توحید افعالی سے تعبیر کیا جاتا ہے. توحید افعالی کا شمار ان عظیم معارف اور تعلیمات میں ہوتا ہے جو انسان کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس مطلب پر بڑی تاکید کی گئی ہے. اور مختلف بیانات کے ذریعے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے.

جیسا کہ تمام موجودات کا خدا کے اذن وارادہ اور اس کی قضا و مشیت سے وابستہ ہونے کا عقیدہ اس مطلب کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے.

کلامی مسائل میں سے یہ مسئلہ اتنا دقیق ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے عقل اور فکری رشد کے ساتھ ساتھ اس عنوان کی صحیح تبیین اور وضاحت کی بھی ضرورت ہے. یہی وجہ ہے کہ جو لوگ رشد عقلی سے تہی دست تھے یا جنہوں نے قرآن کے حقیقی مفسرین یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیمات سے منہ پھیر لیا وہ لوگ اس مطلب کو سمجھنے میں لغزش اور غلطی سے دوچار ہوئے ہیں. قرآن مجید کی صریح اور واضح آیات کے بر خلاف نظام علت و معلول اور سبب و مسبّب کی نفی کرتے ہوئے، تمام افعال کا سبب تام اور علت فقط خدا کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں. اور کائنات میں موجود نظام اسباب و مسببات کی نفی کر دی ہے، اور یہ کہا ہے کہ سنت الٰہی و طریقہ خداوندی یہ ہے کہ جس وقت آگ موجود ہو اسی وقت حرارت کو ایجاد کرے یا کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کو

وجود میں لائے. ایسا نہیں ہے کہ آگ حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی سیری اور سیرابی کے حصول میں کسی قسم کا کردار ادا کرتے ہوں.

جیسا کہ گذشتہ دروس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید کا شمار عظیم معارف میں ہوتا ہے کہ جو انسانوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اسی وجہ سے قرآن میں اس مطلب کی طرف بڑی تاکید ہوئی ہے، اور مختلف بیانات کے ذریعہ اس مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، منجملہ تمام موجودات کا اذن و مشیت ،ارادہ و قضاے الٰہی سے وابستہ ہونے پر ایمان لانا وغیرہ .

لیکن اس مطلب کو سمجھنے کے لئے رشد فکری اور عقلی بالیدگی کے علاوہ صحیح تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو عقلی بالیدگی سے متصف نہیں تھے یا ان کی تعلیم میں نقص تھا یعنی جھنوں نے معصوم رہنماؤں، اور قرآن کے حقیقی مفسرین سے استفادہ نہیں کیا، انہوں نے ، اس مطلب کو سمجھنے میں غلطی کی، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے نیز اسی سے مخصوص ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے برخلاف انہوں نے اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے اور اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثلاً الٰہی طریقہ کار یہ ہے کہ جب آگ کا موجود ہوگا تو اس کی حرارت بھی پائی جائے گی اسی طرح کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کا وجود ضروری ہے ، وگرنہ ایسا نہیں ہے کہ آگ ، حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی، سیری و سیرابی کے حاصل ہونے میں کرئی رول ادا کرتے ہیں ہیں .

اس انحراف فکری کے برے نتائج اس وقت آشکار ہوتے ہیں کہ جب ہم ان نتائج کو انسان کے افعالِ اختیاری اور اس کی ذمہ داریوں کے تحت تجزیہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرتے ہیں، یعنی ایسی فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خدا سے منسوب ہوں، اور ان امور کے تحت انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے ، لہٰذا اس صورت میں کوئی بھی اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا.

ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کج اندیشی کا تباہ کن نتیجہ جبر ہے یعنی انسانوں کا اپنے اعمال کے سبب کسی بھی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے تمام نظام، خواہ اخلاقی ہوں یا تربیتی، فردی ہوں یا اجتماعی، بلکہ تشریعی نظام تو سرے ہی سے باطل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جب انسان اپنے امور میں اختیار کا مالک نہ رہا تو پھر اس کے لئے وظیفہ، تکلیف، امر، نہی، ثواب و عذاب وغیرہ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا، بلکہ اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام تکوینی بے بنیاد ہو جائیں اس لئے کہ آیات قرآنی[1] اور احادیث کے علاوہ براہین عقلی سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہان کی خلقت کا ہدف انسان کی خلقت کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے تاکہ یہ انسان

[1]. ان آیات کی طرف مراجعہ کریں. سورۂ ہود. آیت/ ۷ . سورۂ ملک. آیت/۲. سورۂ کہف. آیت/ ۷. سورۂ ذاریات. آیت/۵۷. سورۂ توبہ. آیت/ ۷۲

اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت واطاعت اور بندگی کے ذریعہ کمالات کے عظیم درجات اور قرب پروردگار کا مالک بن جائے، اور اس کے اندر پروردگار کی خصوصی رحمت کے مالک بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے لیکن اگر انسان تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی، اور خدا کی جاودانی نعمتوں سے سرفرازی کا اہل نہیں ہو سکتا.

اور اس طرح ہدف خلقت کا نقض ہونا لازم آئے گا. جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلقت کی مشینری ایک کھلونا بن جائے، اور پھر جبری انداز میں کچھ انسان خلق ہوں، اور چند حرکات وافعال کے نتیجہ میں بعض کو سزا اور بعض کو جزا دے دی جائے، جبکہ اس امر کی انجام دہی میں سارا کردار اسی مشینری کا ہے اور انسان مجبور ہے.

اس فکر کے پھیلنے میں اہم ترین عامل ظالم حکومتوں کے مذموم مقاصد ہیں، جو اپنے ناشائستہ امور کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتے تھے، جو اس حربہ کو کمزوروں پر اپنی برتری کے لئے اور مظلوموں کے قیام کو دبانے کے لئے استعمال کرتے تھے، یقیناً ایسے نتائج کے پیش نظر، ملتوں کو خواب غفلت میں رکھنے کے لئے جبر کو ایک خطرناک سبب ماننا ہوگا.

اس کے علاوہ وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس نظریہ کے نقطہ ضعف سے آشنا تھے لیکن توحید کامل اور نفی جبر کے درمیان کوئی راہ حل نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے، وہ تفویض کے قائل ہوگئے، اور انسان کے اختیاری افعال کو فاعلیت الٰہی کے دائرے سے خارج سمجھ بیٹھے اور اس طرح سے وہ اس اشتباہ میں مبتلا ہوگئے، اور یوں اسلام کے عظیم معارف اور اس کے فوائد سے محروم ہوگئے.

لیکن وہ لوگ کہ جو ایسے عظیم معارف کو درک کرنے کی استعداد سے سرافراز تھے اور قرآن کے حقیقی مفسرین کی معرفت حاصل کر چکے تھے، وہ اس کج فکری سے محفوظ رہ گئے، چونکہ انہوں نے اپنی فاعلیت اختیاری کو اس قدرت کے سایہ میں دیکھا جسے خدا نے انھیں عطا کیا تھا لہٰذا اس قدرت کی وجہ سے حاصل ہونے والے افعال کی ذمہ داری قبول کرلی، اور اس کے علاوہ خدا کی جانب سے تاثیر استقلالی کو درک کرلیا، اس طرح وہ ان مفید نتائج کے حصول میں کامیاب ہوگئے.

خاندان نبوت سے حاصل ہونے والی روایات میں اس بحث کے اثرات ملتے ہیں، احادیث میں استطاعت، جبر و تفویض کے عنوان کے تحت اور اس کے علاوہ اذن، مشیت، ارادہ، قضا وقدر الٰہی کے ابواب میں ذکر کیے گئے ہیں.

ان مطالب کے علاوہ بعض روایتوں میں ایسے لوگوں کو ان مسائل میں غور و فکر کرنے سے روکا گیا ہے کہ جو فکری اعتبار سے ضعیف ہیں تاکہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہیں.

ہاں، جبر واختیار کی مختلف اقسام ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے، لہٰذا اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں سے فقط بعض مسائل کو ذکر کریں گے اور ان لوگوں کو ہماری یہ تلقین ہے کہ جو مزید تحقیق کے خواہاں ہیں کہ وہ عقلی و فلسفی بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں صبر اور دقت سے کام لیں.

اختیار کی وضاحت

ارادہ کی قوت، امور یقینی میں سے ہے، کہ جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان خطا ناپذیر علم حضوری کے ذریعہ اسے اپنے وجود میں درک کرتا ہے، جیسا کہ اسی علم کے ذریعہ اپنی بقیہ روحی خصوصیات کا پتہ لگاتا ہے یہاں تک کہ علم حضوری ہی کے ذریعہ کسی امر کے سلسلہ میں شک کا بھی احساس کرتا ہے، اور اسے درک کرنے میں کوئی شک نہیں کرتا.

اسی طرح انسان ایک معمولی توجہ کے ذریعہ اپنے وجود میں اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ تکلم کر سکتا ہے یا نہیں، غذا تناول کر سکتا ہے یا نہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتا ہے یا نہیں.

کسی بھی امر کو انجام دینے کا ارادہ کرنا کبھی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک بھوکا کھانا کھانے کا ارادہ کرتا ہے، یا ایک پیاسا پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی عقلی آرزوؤں کو پورا کرنے اور انسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ارادہ کیا جاتا ہے جیسے کہ ایک مریض اپنی سلامتی حاصل کرنے کے لئے تلخ دوائیں کھاتا ہے، اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے، یا ایک محقق اپنے مقصود کی تلاش میں مادیات سے چشم پوشی کرتا ہے اور بے شمار زحمتیں تحمل کرتا ہے یا ایک فداکار فوجی اپنے ہدف تک پہنچنے میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے.

دراصل انسان کی عظمتوں کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب مختلف خواہشیں جمع ہوں، اور اس کے بعد انسان، فضائل اخلاقی، کرامت نفسانی، اور قرب خداوندی و رضوان الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پست اور حیوانی خواہشات سے چشم پوشی کر لے، اس لئے کہ کوئی بھی عمل جس قدر دلچسپی اور کامل ارادہ سے انجام دیا جائے گا، اسی کے مطابق روحی تکامل یا تنزل حاصل ہوگا، اور اسی اعتبار سے جزاء و سزا کا مستحق ہوگا.

البتہ نفسانی خواہشات کے مد مقابل ٹھہرنے کی طاقت تمام انسانوں میں برابر نہیں ہے لیکن تمام انسانوں میں یہ (ارادہ) موہبت الٰہی موجود ہے انسان اگر چاہے تو تمرین کے ذریعہ اسے قوی بنا سکتا ہے.

لہٰذا ارادہ کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور مختلف طرح کے شبہات ذہن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ارادہ جیسے امرِ وجدانی کے سلسلہ میں شک وتردید نہیں ہونا چاہئے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کردیا ہے کہ اختیار کا وجود ایک آشکار اصول کے عنوان سے تمام ادیانِ آسمانی، شرائع، اور تربیتی واخلاقی نظاموں میں قبول شدہ ہے اور اس کے بغیر ذمہ داری، امر، نہی، جزاوسزا کا کوئی مطلب نہیں ہے.

وہ امور جو اس حقیقت سے انحراف کا باعث ہوتے ہیں اور جبر سے لگاؤ کا سبب بنتے ہیں ہمیں ان کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس وسوسہ کا خاتمہ ہوجائے لہٰذا اس مقام پر چند شبہات کے جوابات پیش کئے جارہے ہیں.

سبق نمبر ۲۹

شبہات کے جوابات

جبریون کے اہم ترین شبہات درج ذیل ہیں.

۱. انسان کا ارادہ باطنی میلانات کا نتیجہ ہے، اور یہ میلانات نہ انسان کے اختیار میں ہیں اور نہ ہی ان کے ظہور میں کوئی خارجی عامل سبب بنا ہے، لہٰذا اس طرح اختیار اور انتخاب کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا.

جواب. اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ میلانات کا اٹھنا ارادہ کے بننے کا سبب ہے نہ یہ کہ کسی امر کو انجام دینے کے لئے کسی ارادہ کے وجود کا سبب ہے، جبر کا نتیجہ یہ ہے، کہ جب خواہشات ظہور کریں تو استقامت کی قوت سلب ہوجائے ،حالانکہ بہت سے امور میں انسان شک کرتا ہے کہ اسے انجام دے یا نہ دے اور کسی بھی امر کو انجام دینے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے جو کبھی سود ومنفعت، تو کبھی دشواری کا سبب ہے.

۲. مختلف علوم میں یہ امر ثابت ہوچکا ہے کہ مختلف عوامل جیسے وراثت، (غذائیات اور دواؤں کے نتیجہ میں) غدود کے ترشحات، اجتماعی عوامل، انسان کے ارادہ کے موجود ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور انسانوں کے اخلاق کا بدلنا انہیں عوامل کے اختلاف کا سبب ہے جیسا کہ دینی متون میں بھی اسی مطلب کی طرف تاکید کی جاتی ہے، لہٰذا انسانی افعال کو آزاد، ارادہ کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا.

جواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آزاد ارادہ کو قبول کرلینے کا مطلب ان عوامل کی اثر گذاری کا منکر ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان عوامل کے ہوتے ہوئے بھی استقامت کرسکتا ہے اور مختلف خواہشات کے ہجوم کے وقت کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے.

البتہ یہ امر مسلم ہے کہ کبھی کبھی یہ عوامل انتخاب میں دشواری کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقاومت کرنا اور کسی ایک کا انتخاب کرلینا، کمال میں تاثیر اور جزا کے مستحق ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ غیر معمولی ہیجانات سزا کے کم ہونے اور جرم میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں.

۳. خدا تمام موجودات منجملہ افعالِ انسان کے وقوع سے پہلے پوری طرح ان سے آگاہ ہے، اور علم الٰہی میں کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا تمام حوادث، علم الٰہی کے مطابق واقع ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس مقام میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا.

جواب : اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی ہر اس حادثہ سے متعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ واقع ہونے والا ہے، اور انسان کے افعال اختیاری وصف اختیاریّت کے ہمراہ خدا کے نزدیک معلوم ہیں پس اگر یہ افعال وصف جبریت کے ساتھ واقع ہوں تو علم الٰہی کے خلاف واقع ہوں گے.

جیسے خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت میں ایک عمل کو انجام دینے کا ارادہ بنانے والا ہے اور اسے ضرور انجام دے گا، یہاں پر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم صرف وقوع فعل سے متعلق ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار سے بھی مربوط ہے لہٰذا علم الٰہی انسان کے آزاد ارادہ اور اس کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا.

جبریون کا ایک دوسرا شبہ قضا و قدر کے سلسلہ میں ہے ان کے اعتقاد کے مطابق انسان کے اختیار سے سازگار نہیں ہے اور ہم آئندہ دروس میں اس مطلب کے تحت گفتگو کریں گے.

خلاصہ

۱. وہ لوگ جنہوں نے معصوم رہنماؤں سے راہنمائی حاصل نہیں کی جبر و اختیار کو سمجھنے میں غلطی کی اور اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افعال انسانی خدا سے منسوب ہوں اور انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے.

۲. اس فکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تکوینی نظام بے بنیاد ہو جائے کیونکہ نظام تکوین کے مطابق انسان اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت و بندگی کرکے قرب پروردگار کا مالک بن جائے لیکن اگر انسان تمام افعال سے بری الذمہ ہو جائے اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی تک نہیں پہنچ سکتا.

۳. اس فکر کے مطابق ہدف خلقت بے فائدہ ہو جائے گا.

۴. اس فکر کو پھیلانے والی ظالم حکومتیں ہیں جو اپنے مذموم مقاصد کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتی ہیں.

۵. اختیار کو انسان علم حضوری کے ذریعے درک کرتا ہے.
۶. وہ لوگ جو نظریہ جبر کے نقطہ ضعف سے آگاہ تھے لیکن راہ حل نہیں نکال سکتے تھے وہ تفویض کے قائل ہو گئے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

اٹھائیسواں سبق

جبر واختیار

بیچلر B.A

تمہید

جبر واختیار ایک کلامی بحث ہے جو عدل الٰہی سے مربوط ہے. کچھ لوگوں نے جبر واختیار کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے انہوں نے آیات الٰہی کے بر خلاف اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کے انسان کے تمام افعال کا ذمہ دار اللہ کو ٹھہرایا گیا اور انسان سے فاعلیت کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی ہے. لہٰذا کوئی بھی شخص اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا اور انسان اپنے تمام افعال میں مجبور ہے اسی نکتہ کی ہم اس سبق میں وضاحت کریں گے .

تفصیل

گزشتہ درسوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود میں ذات واجب الوجود یعنی خدائے یکیا کے محتاج ہیں، اسی طرح اپنے افعال میں بھی اسی ذات کے محتاج ہیں. یعنی موجودات عالم سے صادر ہونے والے افعال میں مؤثر حقیقی ذات واجب الوجود ہے. علم کلام کی اصطلاح میں اسی معنی اور مفہوم کو توحید افعالی سے تعبیر کیا جاتا ہے. توحید افعالی کا شمار ان عظیم معارف اور تعلیمات میں ہوتا ہے جو انسان کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس مطلب پر بڑی تاکید کی گئی ہے. اور مختلف بیانات کے ذریعے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے.

جیسا کہ تمام موجودات کا خدا کے اذن وارادہ اور اس کی قضا و مشیت سے وابستہ ہونے کا عقیدہ اس مطلب کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے.

کلامی مسائل میں سے یہ مسئلہ اتنا دقیق ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے عقل اور فکری رشد کے ساتھ ساتھ اس عنوان کی صحیح تبیین اور وضاحت کی بھی ضرورت ہے. یہی وجہ ہے کہ جو لوگ رشد عقلی سے تہی دست تھے یا جنہوں نے قرآن کے حقیقی مفسرین یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیمات سے منہ پھیر لیا وہ لوگ اس مطلب کو سمجھنے میں لغزش اور غلطی سے دوچار ہوئے ہیں. قرآن مجید کی صریح اور واضح آیات کے بر خلاف نظام علت و معلول اور سبب و مسبّب کی نفی کرتے ہوئے، تمام افعال کا سبب تام اور علت فقط خدا کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں. اور کائنات میں موجود نظام اسباب و مسببات کی نفی کر دی ہے، اور یہ کہا ہے کہ سنت الٰہی و طریقہ خداوندی یہ ہے کہ جس وقت آگ موجود ہو اسی وقت حرارت کو ایجاد کرے یا کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کو

وجود میں لائے. ایسا نہیں ہے کہ آگ حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی سیری اور سیرابی کے حصول میں کسی قسم کا کردار ادا کرتے ہوں.

جیسا کہ گذشتہ دروس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید کا شمار عظیم معارف میں ہوتا ہے کہ جو انسانوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اسی وجہ سے قرآن میں اس مطلب کی طرف بڑی تاکید ہوئی ہے، اور مختلف بیانات کے ذریعہ اس مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، منجملہ تمام موجودات کا اذن و مشیت ،ارادہ و قضاے الٰہی سے وابستہ ہونے پر ایمان لانا وغیرہ .

لیکن اس مطلب کو سمجھنے کے لئے رشد فکری اور عقلی بالیدگی کے علاوہ صحیح تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو عقلی بالیدگی سے متصف نہیں تھے یا ان کی تعلیم میں نقص تھا یعنی جھنوں نے معصوم رہنماؤں، اور قرآن کے حقیقی مفسرین سے استفادہ نہیں کیا، انہوں نے ، اس مطلب کو سمجھنے میں غلطی کی، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے نیز اسی سے مخصوص ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے برخلاف انہوں نے اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے اور اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثلاً الٰہی طریقہ کار یہ ہے کہ جب آگ کا موجود ہوگا تو اس کی حرارت بھی پائی جائے گی اسی طرح کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کا وجود ضروری ہے ، وگرنہ ایسا نہیں ہے کہ آگ ، حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی، سیری و سیرابی کے حاصل ہونے میں کرئی رول ادا کرتے ہیں ہیں .

اس انحراف فکری کے برے نتائج اس وقت آشکار ہوتے ہیں کہ جب ہم ان نتائج کو انسان کے افعالِ اختیاری اور اس کی ذمہ داریوں کے تحت تجزیہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرتے ہیں، یعنی ایسی فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خدا سے منسوب ہوں، اور ان امور کے تحت انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے ، لہٰذا اس صورت میں کوئی بھی اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا.

ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کج اندیشی کا تباہ کن نتیجہ جبر ہے یعنی انسانوں کا اپنے اعمال کے سبب کسی بھی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے تمام نظام، خواہ اخلاقی ہوں یا تربیتی، فردی ہوں یا اجتماعی، بلکہ تشریعی نظام تو سرے ہی سے باطل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جب انسان اپنے امور میں اختیار کا مالک نہ رہا تو پھر اس کے لئے وظیفہ، تکلیف، امر، نہی، ثواب و عذاب وغیرہ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا، بلکہ اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام تکوینی بے بنیاد ہو جائیں اس لئے کہ آیات قرآنی[1] اور احادیث کے علاوہ براہین عقلی سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہان کی خلقت کا ہدف انسان کی خلقت کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے تاکہ یہ انسان

[1]. ان آیات کی طرف مراجعہ کریں. سورۂ ہود. آیت/ ۷ . سورۂ ملک. آیت/۲. سورۂ کہف. آیت/ ۷. سورۂ ذاریات. آیت/۵۷. سورۂ توبہ. آیت/ ۷۲

اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت و اطاعت اور بندگی کے ذریعہ کمالات کے عظیم درجات اور قرب پروردگار کا مالک بن جائے، اور اس کے اندر پروردگار کی خصوصی رحمت کے مالک بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے لیکن اگر انسان تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی، اور خدا کی جاودانی نعمتوں سے سرفرازی کا اہل نہیں ہو سکتا.

اور اس طرح ہدف خلقت کا نقض ہونا لازم آئے گا. جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلقت کی مشینری ایک کھلونا بن جائے، اور پھر جبری انداز میں کچھ انسان خلق ہوں، اور چند حرکات و افعال کے نتیجہ میں بعض کو سزا اور بعض کو جزا دے دی جائے، جبکہ اس امر کی انجام دہی میں سارا کردار اسی مشینری کا ہے اور انسان مجبور ہے.

اس فکر کے پھیلنے میں اہم ترین عامل ظالم حکومتوں کے مذموم مقاصد ہیں، جو اپنے ناشائستہ امور کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتے تھے، جو اس حربہ کو کمزوروں پر اپنی برتری کے لئے اور مظلوموں کے قیام کو دبانے کے لئے استعمال کرتے تھے، یقیناً ایسے نتائج کے پیش نظر، ملتوں کو خواب غفلت میں رکھنے کے لئے جبر کو ایک خطرناک سبب ماننا ہوگا.

اس کے علاوہ وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس نظریہ کے نقطہ ضعف سے آشنا تھے لیکن توحید کامل اور نفی جبر کے درمیان کوئی راہ حل نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے، وہ تفویض کے قائل ہوگئے، اور انسان کے اختیاری افعال کو فاعلیت الٰہی کے دائرے سے خارج سمجھ بیٹھے اور اس طرح سے وہ اس اشتباہ میں مبتلا ہوگئے، اور یوں اسلام کے عظیم معارف اور اس کے فوائد سے محروم ہوگئے.

لیکن وہ لوگ کہ جو ایسے عظیم معارف کو درک کرنے کی استعداد سے سرافراز تھے اور قرآن کے حقیقی مفسرین کی معرفت حاصل کر چکے تھے، وہ اس کج فکری سے محفوظ رہ گئے، چونکہ انہوں نے اپنی فاعلیت اختیاری کو اس قدرت کے سایہ میں دیکھا جسے خدا نے انھیں عطا کیا تھا لہٰذا اس قدرت کی وجہ سے حاصل ہونے والے افعال کی ذمہ داری قبول کرلی، اور اس کے علاوہ خدا کی جانب سے تاثیر استقلالی کو درک کرلیا، اس طرح وہ ان مفید نتائج کے حصول میں کامیاب ہوگئے.

خاندان نبوت سے حاصل ہونے والی روایات میں اس بحث کے اثرات ملتے ہیں، احادیث میں استطاعت، جبر و تفویض کے عنوان کے تحت اور اس کے علاوہ اذن، مشیت، ارادہ، قضا و قدر الٰہی کے ابواب میں ذکر کیے گئے ہیں.

ان مطالب کے علاوہ بعض روایتوں میں ایسے لوگوں کو ان مسائل میں غور و فکر کرنے سے روکا گیا ہے کہ جو فکری اعتبار سے ضعیف ہیں تاکہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہیں.

ہاں، جبر واختیار کی مختلف اقسام ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے، لہٰذا اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں سے فقط بعض مسائل کو ذکر کریں گے اور ان لوگوں کو ہماری یہ تلقین ہے کہ جو مزید تحقیق کے خواہاں ہیں کہ وہ عقلی و فلسفی بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں صبر اور دقت سے کام لیں.

اختیار کی وضاحت

ارادہ کی قوت، امور یقینی میں سے ہے، کہ جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان خطا ناپذیر علم حضوری کے ذریعہ اسے اپنے وجود میں درک کرتا ہے، جیسا کہ اسی علم کے ذریعہ اپنی بقیہ روحی خصوصیات کا پتہ لگاتا ہے یہاں تک کہ علم حضوری ہی کے ذریعہ کسی امر کے سلسلہ میں شک کا بھی احساس کرتا ہے، اور اسے درک کرنے میں کوئی شک نہیں کرتا.

اسی طرح انسان ایک معمولی توجہ کے ذریعہ اپنے وجود میں اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ تکلم کر سکتا ہے یا نہیں، غذا تناول کر سکتا ہے یا نہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتا ہے یا نہیں.

کسی بھی امر کو انجام دینے کا ارادہ کرنا کبھی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک بھوکا کھانا کھانے کا ارادہ کرتا ہے، یا ایک پیاسا پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی عقلی آرزوؤں کو پورا کرنے اور انسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ارادہ کیا جاتا ہے جیسے کہ ایک مریض اپنی سلامتی حاصل کرنے کے لئے تلخ دوائیں کھاتا ہے، اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے، یا ایک محقق اپنے مقصود کی تلاش میں مادیات سے چشم پوشی کرتا ہے اور بے شمار زحمتیں تحمل کرتا ہے یا ایک فداکار فوجی اپنے ہدف تک پہنچنے میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے.

دراصل انسان کی عظمتوں کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب مختلف خواہشیں جمع ہوں، اور اس کے بعد انسان، فضائل اخلاقی، کرامت نفسانی، اور قرب خداوندی و رضوان الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پست اور حیوانی خواہشات سے چشم پوشی کر لے، اس لئے کہ کوئی بھی عمل جس قدر دلچسپی اور کامل ارادہ سے انجام دیا جائے گا، اسی کے مطابق روحی تکامل یا تنزل حاصل ہوگا، اور اسی اعتبار سے جزاء و سزا کا مستحق ہوگا.

البتہ نفسانی خواہشات کے مد مقابل ٹھہرنے کی طاقت تمام انسانوں میں برابر نہیں ہے لیکن تمام انسانوں میں یہ (ارادہ) موہبت الٰہی موجود ہے انسان اگر چاہے تو تمرین کے ذریعہ اسے قوی بنا سکتا ہے.

لہٰذا ارادہ کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور مختلف طرح کے شبہات ذہن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ارادہ جیسے امرِ وجدانی کے سلسلہ میں شک وتردید نہیں ہونا چاہئے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کردیا ہے کہ اختیار کا وجود ایک آشکار اصول کے عنوان سے تمام ادیانِ آسمانی، شرائع، اور تربیتی واخلاقی نظاموں میں قبول شدہ ہے اور اس کے بغیر ذمہ داری، امر، نہی، جزاوسزا کا کوئی مطلب نہیں ہے.

وہ امور جو اس حقیقت سے انحراف کا باعث ہوتے ہیں اور جبر سے لگاؤ کا سبب بنتے ہیں ہمیں ان کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس وسوسہ کا خاتمہ ہوجائے لہٰذا اس مقام پر چند شبہات کے جوابات پیش کئے جارہے ہیں.

سبق نمبر ۲۹

شبہات کے جوابات

جبریون کے اہم ترین شبہات درج ذیل ہیں.

۱. انسان کا ارادہ باطنی میلانات کا نتیجہ ہے، اور یہ میلانات نہ انسان کے اختیار میں ہیں اور نہ ہی ان کے ظہور میں کوئی خارجی عامل سبب بنا ہے، لہٰذا اس طرح اختیار اور انتخاب کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا.

جواب. اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ میلانات کا اٹھنا ارادہ کے بننے کا سبب ہے نہ یہ کہ کسی امر کو انجام دینے کے لئے کسی ارادہ کے وجود کا سبب ہے، جبر کا نتیجہ یہ ہے، کہ جب خواہشات ظہور کریں تو استقامت کی قوت سلب ہوجائے ،حالانکہ بہت سے امور میں انسان شک کرتا ہے کہ اسے انجام دے یا نہ دے اور کسی بھی امر کو انجام دینے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے جو کبھی سود ومنفعت، تو کبھی دشواری کا سبب ہے.

۲. مختلف علوم میں یہ امر ثابت ہوچکا ہے کہ مختلف عوامل جیسے وراثت، (غذائیات اور دواؤں کے نتیجہ میں) غدود کے ترشحات، اجتماعی عوامل، انسان کے ارادہ کے موجود ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور انسانوں کے اخلاق کا بدلنا انہیں عوامل کے اختلاف کا سبب ہے جیسا کہ دینی متون میں بھی اسی مطلب کی طرف تاکید کی جاتی ہے، لہٰذا انسانی افعال کو آزاد، ارادہ کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا.

جواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آزاد ارادہ کو قبول کرلینے کا مطلب ان عوامل کی اثر گذاری کا منکر ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان عوامل کے ہوتے ہوئے بھی استقامت کرسکتا ہے اور مختلف خواہشات کے ہجوم کے وقت کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے.

البتہ یہ امر مسلم ہے کہ کبھی کبھی یہ عوامل انتخاب میں دشواری کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقاومت کرنا اور کسی ایک کا انتخاب کرلینا، کمال میں تاثیر اور جزا کے مستحق ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ غیر معمولی ہیجانات سزا کے کم ہونے اور جرم میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں.

۳. خدا تمام موجودات منجملہ افعالِ انسان کے وقوع سے پہلے پوری طرح ان سے آگاہ ہے، اور علم الٰہی میں کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا تمام حوادث، علم الٰہی کے مطابق واقع ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس مقام میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا.

جواب : اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی ہر اس حادثہ سے متعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ واقع ہونے والا ہے، اور انسان کے افعال اختیاری وصف اختیاریّت کے ہمراہ خدا کے نزدیک معلوم ہیں پس اگر یہ افعال وصف جبریت کے ساتھ واقع ہوں تو علم الٰہی کے خلاف واقع ہوں گے.

جیسے خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت میں ایک عمل کو انجام دینے کا ارادہ بنانے والا ہے اور اسے ضرور انجام دے گا، یہاں پر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم صرف وقوع فعل سے متعلق ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار سے بھی مربوط ہے لہٰذا علم الٰہی انسان کے آزاد ارادہ اور اس کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا.

جبریون کا ایک دوسرا شبہ قضا و قدر کے سلسلہ میں ہے ان کے اعتقاد کے مطابق انسان کے اختیار سے سازگار نہیں ہے اور ہم آئندہ دروس میں اس مطلب کے تحت گفتگو کریں گے.

خلاصہ

۱. وہ لوگ جنہوں نے معصوم رہنماؤں سے راہنمائی حاصل نہیں کی جبر و اختیار کو سمجھنے میں غلطی کی اور اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افعال انسانی خدا سے منسوب ہوں اور انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے.

۲. اس فکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تکوینی نظام بے بنیاد ہو جائے کیونکہ نظام تکوین کے مطابق انسان اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت و بندگی کرکے قرب پروردگار کا مالک بن جائے لیکن اگر انسان تمام افعال سے بری الذمہ ہو جائے اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی تک نہیں پہنچ سکتا.

۳. اس فکر کے مطابق ہدف خلقت بے فائدہ ہو جائے گا.

۴. اس فکر کو پھیلانے والی ظالم حکومتیں ہیں جو اپنے مذموم مقاصد کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتی ہیں.

۵. اختیار کو انسان علم حضوری کے ذریعے درک کرتا ہے.
۶. وہ لوگ جو نظریہ جبر کے نقطہ ضعف سے آگاہ تھے لیکن راہ حل نہیں نکال سکتے تھے وہ تفویض کے قائل ہو گئے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

انیسواں سبق

جبر واختیار

بیچلر B.A

تمہید

جبر واختیار ایک کلامی بحث ہے جو عدل الٰہی سے مربوط ہے. کچھ لوگوں نے جبر واختیار کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے انہوں نے آیات الٰہی کے بر خلاف اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کے انسان کے تمام افعال کا ذمہ دار اللہ کو ٹھہرایا گیا اور انسان سے فاعلیت کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی ہے. لہٰذا کوئی بھی شخص اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا اور انسان اپنے تمام افعال میں مجبور ہے اسی نکتہ کی ہم اس سبق میں وضاحت کریں گے .

تفصیل

گزشتہ درسوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود میں ذات واجب الوجود یعنی خدائے یکیا کے محتاج ہیں، اسی طرح اپنے افعال میں بھی اسی ذات کے محتاج ہیں. یعنی موجودات عالم سے صادر ہونے والے افعال میں مؤثر حقیقی ذات واجب الوجود ہے. علم کلام کی اصطلاح میں اسی معنی اور مفہوم کو توحید افعالی سے تعبیر کیا جاتا ہے. توحید افعالی کا شمار ان عظیم معارف اور تعلیمات میں ہوتا ہے جو انسان کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس مطلب پر بڑی تاکید کی گئی ہے. اور مختلف بیانات کے ذریعے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے.

جیسا کہ تمام موجودات کا خدا کے اذن وارادہ اور اس کی قضا و مشیت سے وابستہ ہونے کا عقیدہ اس مطلب کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے.

کلامی مسائل میں سے یہ مسئلہ اتنا دقیق ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے عقل اور فکری رشد کے ساتھ ساتھ اس عنوان کی صحیح تبیین اور وضاحت کی بھی ضرورت ہے. یہی وجہ ہے کہ جو لوگ رشد عقلی سے تہی دست تھے یا جنہوں نے قرآن کے حقیقی مفسرین یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیمات سے منہ پھیر لیا وہ لوگ اس مطلب کو سمجھنے میں لغزش اور غلطی سے دوچار ہوئے ہیں. قرآن مجید کی صریح اور واضح آیات کے بر خلاف نظام علت و معلول اور سبب و مسبّب کی نفی کرتے ہوئے، تمام افعال کا سبب تام اور علت فقط خدا کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں. اور کائنات میں موجود نظام اسباب و مسببات کی نفی کر دی ہے، اور یہ کہا ہے کہ سنت الٰہی و طریقہ خداوندی یہ ہے کہ جس وقت آگ موجود ہو اسی وقت حرارت کو ایجاد کرے یا کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کو

وجود میں لائے. ایسا نہیں ہے کہ آگ حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی سیری اور سیرابی کے حصول میں کسی قسم کا کردار ادا کرتے ہوں.

جیسا کہ گذشتہ دروس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید کا شمار عظیم معارف میں ہوتا ہے کہ جو انسانوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اسی وجہ سے قرآن میں اس مطلب کی طرف بڑی تاکید ہوئی ہے، اور مختلف بیانات کے ذریعہ اس مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، منجملہ تمام موجودات کا اذن و مشیت ،ارادہ و قضاے الٰہی سے وابستہ ہونے پر ایمان لانا وغیرہ .

لیکن اس مطلب کو سمجھنے کے لئے رشد فکری اور عقلی بالیدگی کے علاوہ صحیح تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو عقلی بالیدگی سے متصف نہیں تھے یا ان کی تعلیم میں نقص تھا یعنی جھنوں نے معصوم رہنماؤں، اور قرآن کے حقیقی مفسرین سے استفادہ نہیں کیا، انہوں نے ، اس مطلب کو سمجھنے میں غلطی کی، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے نیز اسی سے مخصوص ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے برخلاف انہوں نے اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے اور اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثلاً الٰہی طریقہ کار یہ ہے کہ جب آگ کا موجود ہوگا تو اس کی حرارت بھی پائی جائے گی اسی طرح کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کا وجود ضروری ہے ، وگرنہ ایسا نہیں ہے کہ آگ ، حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی، سیری و سیرابی کے حاصل ہونے میں کرئی رول ادا کرتے ہیں ہیں .

اس انحراف فکری کے برے نتائج اس وقت آشکار ہوتے ہیں کہ جب ہم ان نتائج کو انسان کے افعالِ اختیاری اور اس کی ذمہ داریوں کے تحت تجزیہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرتے ہیں، یعنی ایسی فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خدا سے منسوب ہوں، اور ان امور کے تحت انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے ، لہٰذا اس صورت میں کوئی بھی اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا.

ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کج اندیشی کا تباہ کن نتیجہ جبر ہے یعنی انسانوں کا اپنے اعمال کے سبب کسی بھی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے تمام نظام، خواہ اخلاقی ہوں یا تربیتی، فردی ہوں یا اجتماعی، بلکہ تشریعی نظام تو سرے ہی سے باطل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جب انسان اپنے امور میں اختیار کا مالک نہ رہا تو پھر اس کے لئے وظیفہ، تکلیف، امر، نہی، ثواب و عذاب وغیرہ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا، بلکہ اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام تکوینی بے بنیاد ہو جائیں اس لئے کہ آیات قرآنی[1] اور احادیث کے علاوہ براہین عقلی سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہان کی خلقت کا ہدف انسان کی خلقت کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے تاکہ یہ انسان

[1]. ان آیات کی طرف مراجعہ کریں. سورۂ ہود. آیت/ ۷ . سورۂ ملک. آیت/۲. سورۂ کہف. آیت/ ۷. سورۂ ذاریات. آیت/۵۷. سورۂ توبہ. آیت/ ۷۲

اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت واطاعت اور بندگی کے ذریعہ کمالات کے عظیم درجات اور قرب پروردگار کا مالک بن جائے، اور اس کے اندر پروردگار کی خصوصی رحمت کے مالک بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے لیکن اگر انسان تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی، اور خدا کی جاودانی نعمتوں سے سرفرازی کا اہل نہیں ہو سکتا.

اور اس طرح ہدف خلقت کا نقض ہونا لازم آئے گا. جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلقت کی مشینری ایک کھلونا بن جائے، اور پھر جبری انداز میں کچھ انسان خلق ہوں، اور چند حرکات وافعال کے نتیجہ میں بعض کو سزا اور بعض کو جزا دے دی جائے، جبکہ اس امر کی انجام دہی میں سارا کردار اسی مشینری کا ہے اور انسان مجبور ہے.

اس فکر کے پھیلنے میں اہم ترین عامل ظالم حکومتوں کے مذموم مقاصد ہیں، جو اپنے ناشائستہ امور کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتے تھے، جو اس حربہ کو کمزوروں پر اپنی برتری کے لئے اور مظلوموں کے قیام کو دبانے کے لئے استعمال کرتے تھے، یقیناً ایسے نتائج کے پیش نظر، ملتوں کو خواب غفلت میں رکھنے کے لئے جبر کو ایک خطرناک سبب ماننا ہوگا.

اس کے علاوہ وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس نظریہ کے نقطہ ضعف سے آشنا تھے لیکن توحید کامل اور نفی جبر کے درمیان کوئی راہ حل نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے، وہ تفویض کے قائل ہوگئے، اور انسان کے اختیاری افعال کو فاعلیت الٰہی کے دائرے سے خارج سمجھ بیٹھے اور اس طرح سے وہ اس اشتباہ میں مبتلا ہوگئے، اور یوں اسلام کے عظیم معارف اور اس کے فوائد سے محروم ہوگئے.

لیکن وہ لوگ کہ جو ایسے عظیم معارف کو درک کرنے کی استعداد سے سرافراز تھے اور قرآن کے حقیقی مفسرین کی معرفت حاصل کر چکے تھے، وہ اس کج فکری سے محفوظ رہ گئے، چونکہ انہوں نے اپنی فاعلیت اختیاری کو اس قدرت کے سایہ میں دیکھا جسے خدا نے انھیں عطا کیا تھا لہٰذا اس قدرت کی وجہ سے حاصل ہونے والے افعال کی ذمہ داری قبول کرلی، اور اس کے علاوہ خدا کی جانب سے تاثیر استقلالی کو درک کرلیا، اس طرح وہ ان مفید نتائج کے حصول میں کامیاب ہوگئے.

خاندان نبوت سے حاصل ہونے والی روایات میں اس بحث کے اثرات ملتے ہیں، احادیث میں استطاعت، جبر و تفویض کے عنوان کے تحت اور اس کے علاوہ اذن، مشیت، ارادہ، قضا وقدر الٰہی کے ابواب میں ذکر کیے گئے ہیں.

ان مطالب کے علاوہ بعض روایتوں میں ایسے لوگوں کو ان مسائل میں غور و فکر کرنے سے روکا گیا ہے کہ جو فکری اعتبار سے ضعیف ہیں تاکہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہیں.

ہاں، جبر واختیار کی مختلف اقسام ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے، لہٰذا اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں سے فقط بعض مسائل کو ذکر کریں گے اور ان لوگوں کو ہماری یہ تلقین ہے کہ جو مزید تحقیق کے خواہاں ہیں کہ وہ عقلی و فلسفی بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں صبر اور دقت سے کام لیں.

اختیار کی وضاحت

ارادہ کی قوت، امور یقینی میں سے ہے، کہ جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان خطا ناپذیر علم حضوری کے ذریعہ اسے اپنے وجود میں درک کرتا ہے، جیسا کہ اسی علم کے ذریعہ اپنی بقیہ روحی خصوصیات کا پتہ لگاتا ہے یہاں تک کہ علم حضوری ہی کے ذریعہ کسی امر کے سلسلہ میں شک کا بھی احساس کرتا ہے، اور اسے درک کرنے میں کوئی شک نہیں کرتا.

اسی طرح انسان ایک معمولی توجہ کے ذریعہ اپنے وجود میں اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ تکلم کر سکتا ہے یا نہیں، غذا تناول کر سکتا ہے یا نہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتا ہے یا نہیں.

کسی بھی امر کو انجام دینے کا ارادہ کرنا کبھی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک بھوکا کھانا کھانے کا ارادہ کرتا ہے، یا ایک پیاسا پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی عقلی آرزوؤں کو پورا کرنے اور انسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ارادہ کیا جاتا ہے جیسے کہ ایک مریض اپنی سلامتی حاصل کرنے کے لئے تلخ دوائیں کھاتا ہے، اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے، یا ایک محقق اپنے مقصود کی تلاش میں مادیات سے چشم پوشی کرتا ہے اور بے شمار زحمتیں تحمل کرتا ہے یا ایک فداکار فوجی اپنے ہدف تک پہنچنے میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے.

دراصل انسان کی عظمتوں کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب مختلف خواہشیں جمع ہوں، اور اس کے بعد انسان، فضائل اخلاقی، کرامت نفسانی، اور قرب خداوندی و رضوان الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پست اور حیوانی خواہشات سے چشم پوشی کر لے، اس لئے کہ کوئی بھی عمل جس قدر دلچسپی اور کامل ارادہ سے انجام دیا جائے گا، اسی کے مطابق روحی تکامل یا تنزل حاصل ہوگا، اور اسی اعتبار سے جزاء و سزا کا مستحق ہوگا.

البتہ نفسانی خواہشات کے مد مقابل ٹھہرنے کی طاقت تمام انسانوں میں برابر نہیں ہے لیکن تمام انسانوں میں یہ (ارادہ) موہبت الٰہی موجود ہے انسان اگر چاہے تو تمرین کے ذریعہ اسے قوی بنا سکتا ہے.

لہٰذا ارادہ کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور مختلف طرح کے شبہات ذہن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ارادہ جیسے امرِ وجدانی کے سلسلہ میں شک وتردید نہیں ہونا چاہئے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کردیا ہے کہ اختیار کا وجود ایک آشکار اصول کے عنوان سے تمام ادیانِ آسمانی، شرائع، اور تربیتی واخلاقی نظاموں میں قبول شدہ ہے اور اس کے بغیر ذمہ داری، امر، نہی، جزاوسزا کا کوئی مطلب نہیں ہے.

وہ امور جو اس حقیقت سے انحراف کا باعث ہوتے ہیں اور جبر سے لگاؤ کا سبب بنتے ہیں ہمیں ان کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس وسوسہ کا خاتمہ ہوجائے لہٰذا اس مقام پر چند شبہات کے جوابات پیش کئے جارہے ہیں.

سبق نمبر ۲۹

شبہات کے جوابات

جبریون کے اہم ترین شبہات درج ذیل ہیں.

۱. انسان کا ارادہ باطنی میلانات کا نتیجہ ہے، اور یہ میلانات نہ انسان کے اختیار میں ہیں اور نہ ہی ان کے ظہور میں کوئی خارجی عامل سبب بنا ہے، لہٰذا اس طرح اختیار اور انتخاب کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا.

جواب. اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ میلانات کا اٹھنا ارادہ کے بننے کا سبب ہے نہ یہ کہ کسی امر کو انجام دینے کے لئے کسی ارادہ کے وجود کا سبب ہے، جبر کا نتیجہ یہ ہے، کہ جب خواہشات ظہور کریں تو استقامت کی قوت سلب ہوجائے ،حالانکہ بہت سے امور میں انسان شک کرتا ہے کہ اسے انجام دے یا نہ دے اور کسی بھی امر کو انجام دینے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے جو کبھی سود ومنفعت، تو کبھی دشواری کا سبب ہے.

۲. مختلف علوم میں یہ امر ثابت ہوچکا ہے کہ مختلف عوامل جیسے وراثت، (غذائیات اور دواؤں کے نتیجہ میں) غدود کے ترشحات، اجتماعی عوامل، انسان کے ارادہ کے موجود ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور انسانوں کے اخلاق کا بدلنا انہیں عوامل کے اختلاف کا سبب ہے جیسا کہ دینی متون میں بھی اسی مطلب کی طرف تاکید کی جاتی ہے، لہٰذا انسانی افعال کو آزاد، ارادہ کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا.

جواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آزاد ارادہ کو قبول کرلینے کا مطلب ان عوامل کی اثر گذاری کا منکر ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان عوامل کے ہوتے ہوئے بھی استقامت کرسکتا ہے اور مختلف خواہشات کے ہجوم کے وقت کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے.

البتہ یہ امر مسلم ہے کہ کبھی کبھی یہ عوامل انتخاب میں دشواری کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقاومت کرنا اور کسی ایک کا انتخاب کرلینا، کمال میں تاثیر اور جزا کے مستحق ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ غیر معمولی ہیجانات سزا کے کم ہونے اور جرم میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں.

۳. خدا تمام موجودات منجملہ افعالِ انسان کے وقوع سے پہلے پوری طرح ان سے آگاہ ہے، اور علم الٰہی میں کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا تمام حوادث، علم الٰہی کے مطابق واقع ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس مقام میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا.

جواب : اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی ہر اس حادثہ سے متعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ واقع ہونے والا ہے، اور انسان کے افعال اختیاری وصف اختیاریّت کے ہمراہ خدا کے نزدیک معلوم ہیں پس اگر یہ افعال وصف جبریت کے ساتھ واقع ہوں تو علم الٰہی کے خلاف واقع ہوں گے.

جیسے خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت میں ایک عمل کو انجام دینے کا ارادہ بنانے والا ہے اور اسے ضرور انجام دے گا، یہاں پر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم صرف وقوع فعل سے متعلق ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار سے بھی مربوط ہے لہٰذا علم الٰہی انسان کے آزاد ارادہ اور اس کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا.

جبریون کا ایک دوسرا شبہ قضا و قدر کے سلسلہ میں ہے ان کے اعتقاد کے مطابق انسان کے اختیار سے سازگار نہیں ہے اور ہم آئندہ دروس میں اس مطلب کے تحت گفتگو کریں گے.

خلاصہ

۱. وہ لوگ جنہوں نے معصوم رہنماؤں سے راہنمائی حاصل نہیں کی جبر و اختیار کو سمجھنے میں غلطی کی اور اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افعال انسانی خدا سے منسوب ہوں اور انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے.

۲. اس فکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تکوینی نظام بے بنیاد ہو جائے کیونکہ نظام تکوین کے مطابق انسان اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت و بندگی کرکے قرب پروردگار کا مالک بن جائے لیکن اگر انسان تمام افعال سے بری الذمہ ہو جائے اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الٰہی تک نہیں پہنچ سکتا.

۳. اس فکر کے مطابق ہدف خلقت بے فائدہ ہو جائے گا.

۴. اس فکر کو پھیلانے والی ظالم حکومتیں ہیں جو اپنے مذموم مقاصد کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتی ہیں.

۵. اختیار کو انسان علم حضوری کے ذریعے درک کرتا ہے.
۶. وہ لوگ جو نظریہ جبر کے نقطہ ضعف سے آگاہ تھے لیکن راہ حل نہیں نکال سکتے تھے وہ تفویض کے قائل ہو گئے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

تیسواں سبق

قضاوقدر کا مفہوم

بیچلر B.A

تمہید

قضا وقدر پر اعتقاد کا تقاضا یہ ہے کہ موجودات کی پیدایش سے لے کر آخر عمر تک الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لایا جائے، یعنی یہ کہ ہر شی کی پیدایش کا دارومدار قضا و قدر الٰہی پر ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی شیء اپنے حدود میں موجود نہیں ہو سکتی. قضا و قدر الٰہی پر ایمان لانا توحید افعالی کا لازمہ ہے .جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ایک ہے لیکن قضا و قدر الٰہی پر اعتقاد رکھنا باوجود اس کے کہ انسان کو مختار فرض کیا جائے بہت مشکل ہے اس لئے یہ مسئلہ متکلمین کے درمیان بحث و تحیص کا مرکز رہا ہے.

تفصیل

کلمہ "قدر" کے معنی اندازہ اور کلمہ "تقدیر" کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور کسی چیز کو ایک معین اندازے و پیمانے کے مطابق تعمیر و ترقی دینے کے ہیں اور کلمہ "قضا" کے معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں. کبھی یہ دونوں کلمے ایک ساتھ تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں.

تقدیر الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر شی کے لئے کم (مقدار) و کیف (حالت)، زمان و مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں، جو تدریجی اسباب و عوامل کے ذریعہ انجام پاتے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شی اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

اس تفسیر کے مطابق، مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے، اور اس کے تدریجی مراتب ہیں.

، جو قریب، متوسط اور بعید مقدمات کو شامل ہیں اور اسباب و شرائط کے بدلنے کے ساتھ یہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے ایک جنین پہلے نطفہ پھر علقہ، پھر مضغہ یہاں تک کہ ایک کامل انسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس میں زمانی و مکانی تشخصات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اب اس کا ایک مرحلہ میں ساقط ہو جانا، ,, تقدیر، میں تغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن مرحلہ قضا ایک دفعی مسئلہ ہے جو اسباب و شرائط کے فراہم ہونے پر ہی منحصر ہے اس کے بعد اس کا پایا جانا حتمی، و نا قابل تغییر ہے " إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ "[1] جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے.

---

[1]. آل عمران/۴۷

لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ کبھی قضا و قدر دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انہیں حتمی اور غیر حتمی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ روایات اور دعاؤں میں قضا کو بدلنے والے اسباب میں سے "صدقہ" ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلۂ رحم، دعا وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے.

قضاوقدر علمی و عینی

کبھی تقدیر اور قضائے الٰہی، موجودات کی پیدائش کے لئے اسباب و شرائط اور مقدمات کے فراہم ہونے کے تحت، علم خدا کہ معنی میں آیا ہے اسی طرح ان امور کے حتمی واقع ہو جانے کے سلسلہ میں بھی یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں جسے " قضا و قدر علمی " کا نام دیا جاتا ہے، اور کبھی موجودات کی پیدائش کے تدریجی مراحل اور ان کے عینی تحقق کو، خدا کی ذات سے نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جسے "قضاوقدر عینی" کا نام دیا جاتا ہے.

آیات وروایات کی روشنی میں علم الٰہی ان تمام موجودات کو شامل ہوتا ہے کہ جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب خدا کی ایک مخلوق "لوح محفوظ" میں درج ہیں، لہٰذا جو بھی خدا کی اجازت سے اس لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرلے وہ گذشتہ اور آئندہ کے واقعات سے باخبر ہوجاتا ہے، اس لوح محفوظ کے علاوہ دوسرے کم مرتبہ لوح محفوظ بھی ہیں جو واقعات کو ناقص اور حدود و شرائط کے ساتھ بیان کرتے ہیں لہٰذا جو بھی ان تک رسائی حاصل کرلے وہ واقعات کے سلسلہ میں اجمالی علم حاصل کرلیتا ہے، جو قابل تبدیل بھی ہیں، شاید یہ آیت انہی دو قسموں کی طرف اشارہ کررہی ہے " يَمحُو اللّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الكِتَٰبِ "[1] پھر اس میں میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب، لوح محفوظ موجود ہے.

سبق نمبر۳۱

بہر حال قضا و قدر علمی کے اعتبار کے سلسلہ میں اس سے زیادہ مشکلات و دشواریاں نہیں ہیں جو ہم نے خدا کے علم ازلی ہونے کے بارے میں بیان کی ہیں، گذشتہ دروس میں علم الٰہی کے بارے میں جبریوں کے شبہات کے تحت گفتگو ہو چکی ہے اور ان کے شبہات کو کمزور اور ان کے بطلان کو واضح کیا جاچکا ہے.

---

[1]. رعد/۳۹

لیکن قضا و قدر عینی پر اعتقاد کے سلسلہ میں جو مشکل ترین اعتراضات پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات دینا ضروری ہیں اگر چہ اس بابت تاثیر استقلالی میں توحید کے مباحث کے درمیان ایک اجمالی جواب دیا جاچکا ہے.

انسان کے اختیار سے قضا و قدر کا رابطہ.

ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ قضا و قدر عینی پر اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ موجودات کی پیدائش سے کمال تک بلکہ آخر عمر تک حتی کہ الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لانا ہوگا اور پیدائش کے شرائط کے فراہم ہونے سے آخری مرحلہ تک ارادہ الٰہی سے وابستہ ہونے پر یقین کرنا ہوگا.[1]

یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس طرح ہر موجود کا خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کی طرف نسبت دینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی وجود بھی موجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر شی کی پیدائش قضا و قدر الٰہی سے وابستہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی بھی وجود اپنی حدود میں موجود نہیں رہ سکتا، لہٰذا اس نسبت کو بیان کرنا دراصل توحید کی تدریجی تعلیم یعنی تاثیر میں استقلال کے معنی میں ہے جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ہے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں توحید کی یہ قسم عظیم اثرات کی حامل ہے.

لیکن موجودات کو اذن الٰہی اور اس کی مشیت سے نسبت دینا نہایت آسان ہے، برخلاف اس کے آخری مرحلہ کے، نیز قطعی ہونے کی نسبت قضائے الٰہی کی طرف اس لئے دی جاتی ہے کہ اس میں پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ متکلمین کی بحثوں کا مرکز بنا رہا ہے، اس لئے کہ تقدیر کے بننے میں انسان کے مختار ہونے کے اعتقاد کو قبول کرنے کے ساتھ اس اعتقاد (قضاو قدر) کو ماننا اور اس پر ایمان لانا بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے متکلمین کا ایک گروہ (اشاعرہ) چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کا حامی تھا، لہٰذا جبر کا قائل ہوگیا، لیکن متکلمین کا دوسرا گروہ (معتزلہ) چونکہ جبر اور اس کے جبران ناپذیر نقصانات سے آگاہ تھا لہٰذا اسے قبول نہ کرتے ہوئے انسانی افعال میں قضائے الٰہی کی شمولیت کا منکر ہوگیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق انجام دی اور مخالف آیتوں اور روایتوں کی تاویل اور توجیہ کی ہے جسے ہم نے جبر و تفویض کے سلسلہ میں لکھے گئے مفصل رسالہ میں پیش کیا ہے.

---

[1]. ارادہ اور قضا کا ایک دوسرے پر منطبق ہونا سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۴۷ اور سورۂ یٰس کی آیت نمبر ۸۳، کی تطبیق کے ذریعہ یہ مطلب روشن ہوجاتا ہے. "اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ."

لیکن اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعاً انسان کے افعال اختیاری ہیں اور وہ اپنے ارادہ میں مختار ہے تو اسے کس طرح ارادۂ الٰہی اور اس کی قضا سے نسبت دی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس کے افعال کی قضائے الٰہی سے نسبت دی گئی ہے تو پھر کس طرح انسان سے نسبت دی جا سکتی ہے؟

لہٰذا اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے اور ان دونوں نسبتوں کو جمع کرنے کے لئے ایک علت کی طرف چند معلول کو نسبت دینے کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے تاکہ ان دونوں نسبتوں کی نوعیت معلوم ہو سکے.

متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسمیں.

ایک موجود کی پیدائش میں چند علتوں کے اثر انداز ہونے کی چند صورتیں ہیں.

۱. چند علتیں ایک ساتھ اثر انداز ہوں جیسے کہ بیج، پانی، ہوا، سورج جیسے تمام اسباب مل کر سبزہ کے اگنے کا سبب بنتے ہیں.

۲. چند علتیں نیابتاً ایک دوسرے کے بعد عمل کریں جیسے کہ ہوائی جہاز کے متعدد انجن یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہوائی جہاز برابر پرواز کرتا ہے.

۳. چند علتوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا جیسے کہ متعدد گیندوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا، یا متعدد کاروں کا ایک ساتھ اکسیڈنٹ، یا ارادہ کا ہاتھ کی حرکت پر موثر ہونا اور ہاتھ کی حرکت کا اثر انداز ہونا قلم کی حرکت پر اور قلم کی حرکت کا نتیجہ ایک نوشتہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر کا نتیجہ ہیں.

۴. متعدد عوامل کا ایک دوسرے پر موثر ہونا، جبکہ ہر ایک دوسرے سے مستقل ہو، یہ مفروضہ گذشتہ مفروضہ سے بالکل جدا ہے اس لئے کہ وہاں ہاتھ کی حرکت، ارادہ پر منحصر تھی اور قلم کی حرکت، ہاتھ کی حرکت پر منحصر تھی.

ان تمام صورتوں میں چند علتوں کے ذریعہ ایک معلول کا وجود میں آنا لازمی ہے، لہٰذا فعل اختیاری میں ارادۂ الٰہی اور انسان کے ارادے کی تاثیر اسی قسم میں سے ہے، اس لئے کہ انسان اور اس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے.

لیکن وہ صورت کہ جس میں معلول واحد پر دو علتوں کا اجتماع غیر ممکن ہے، وہ دو "ہستی بخش" (وجود آفرین) علتوں کا اجتماع ہے یا ایسی دو علتوں کا اجتماع ہے کہ جو مانعۃ الجمع، مستقل، اور ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز ہوتی ہیں، جیسے کہ ایک ارادہ دو مزید فاعلوں سے وجود میں آئے یا دو مشابہ موجود دو تامہ علتوں کا نتیجہ ہوں.

بتیسواں سبق

شبہہ کا جواب

گذشتہ تشریح کی روشنی میں انسان کے اختیاری افعال کو خدا سے نسبت دینے کے علاوہ خود انسان سے نسبت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسبتیں آپس میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں.
ایک دوسری تعبیر کے مطابق ایک فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دینا یہ ایک مرحلہ ہے اور خود اس کے وجود کو خدا کی طرف نسبت دینا اس شے سے بالاتر مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں خود انسان کا وجود اور وہ مادہ کہ جس پر وہ فعل انجام پاتا ہے اور وہ آلات جس کی مدد سے فعل واقع ہوا ہے سب کے سب اسی سے وابستہ ہیں.
پس انسان کے ارادہ کی تاثیر علت تامہ کے ایک جزء کے عنوان سے اپنے امور میں اس امر سے کوئی منافات نہیں رکھتا، کہ علت تامہ کے تمام اجزاء کو خدا سے نسبت دیدی جائے، اور وہ صرف خدا ہے جو جہان، انسان اور اس کے تمام افعال و کردار کو اپنے دست قدرت میں سنبھالے ہوئے ہے، ہمیشہ انھیں وجود عطا کرتا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک معین شکل میں خلق کرتا ہے لہٰذا کوئی موجود بھی کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور انسان کے اختیاری افعال بھی اس سے بے نیاز اور اس کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اور اس کی تمام خصوصیات، اور صفات الٰہی قضا و قدر سے وابستہ ہیں، لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ، انسان کے ارادہ سے وابستہ ہوں یا خدا کے ارادہ کے تحت ہوں. اس لئے کہ یہ دونوں ارادے، مستقل اور مانعۃ الجمع نہیں ہیں، اور اعمال کو تحقق بخشنے میں ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا ارادہ اس کے وجود کی طرح ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے، اور اسے تحقق بخشنے کے لئے خدا کے ارادہ کی ضرورت ہے. " مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبّ الْعَالَمِيْنَ "[1] اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو سارے جہان کا پالنے والا خدا چاہتا ہے.

عقیدہ قضاوقدر کے اثرات

قضا و قدر پر اعتقاد، معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل (بتدریج کامل ہونے) کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کو ہم یہاں ذکر کریں گے.

---

[1]. تکویر/۲۹

وہ اشخاص جو حوادث کی پیدائش میں ارادہ الٰہی کے مؤثر ہونے اور قضا و قدر الٰہی پر ایمان رکھتے ہوں وہ ناگوار حادثوں سے نہیں ڈرتے، اور نالہ وزاری نہیں کرتے، بلکہ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ حوادث بھی اس کے حکیمانہ ارادہ کا ایک جز ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہے لہٰذا رضاکارانہ اور والھانہ طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں، اور اس طرح صبر و رضا، تسلیم و توکل جیسی صفات کے محور بن جاتے ہیں اور دنیا کی خوشیوں اور رعنائیوں پر مغرور و سرمست نہیں ہوتے اور خدائی نعمتوں کو اپنے لئے فخر کا وسیلہ نہیں سمجھتے.

یہ وہی اثرات ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے. ''مَا اَصَابَ مِنْ مُصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلاَ فِي اَنفُسِكُم اِلاَّ فِي كِتٰبٍ مِن قَبلِ اَن نَّبرَأَهَا اِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ * لِّكَيلاَ تَأسَوا عَلَى مَافَاتَكُم وَلاَ تَفرَحُوا بِمَاءَ اتَكُم وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُختَالٍ فَخُورٍ ''[1] جتنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوئی ہیں قبل اس کے کہ ہم انھیں ظاہر کریں (لوح محفوظ) پر مکتوب ہیں بیشک یہ خدا پر آسان ہے، تاکہ جب تم سے کوئی چیز چھین لی جائے اس کا رنج نہ کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترایا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا. لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید قضا و قدر سے غلط مطلب نکالنا انتہائی سستی، کاہلی اور ذمہ داریوں سے منہ موڑنا ہے. اور ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ جاودانی سعادت و شقاوت ہمارے اختیاری افعال میں مضمر ہے.'' لَهَا مَا كَسَبَت وَ عَلَيهَا مَا اكتَسَبَت ''[2] اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لئے اور برا کام کیا تو (اس کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گا،'' وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ''.[3] اور انسان کے لئے نہیں ہے مگر یہ کہ جتنی وہ کوشش کرے .

---

[1]. حدید/۲۳،۲۲

[2]. بقرہ/۲۸۶

[3]. نجم/۳۹

خلاصہ

۱. کلمہ قدر کے معنی اندازہ اور تقدیر کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور تقدیر الٰہی کا مطلب یہ کہ خدا نے ہر شی کے لئے مقدار، حالت، زمانہ اور مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں جو اسباب و عوامل کے تابع ہیں.

۲. قضا کے لغوی معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شیء اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

۳. مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے اور یہ قریب، متوسط اور بعید مراتب میں تقسیم ہوتا ہے.

۴. قضا و قدر دو قسم کے ہیں علمی اور عینی. علمی، یعنی اسباب و شرائط، اللہ کے علم میں ہیں اور عینی، امور کے حتمی واقع ہونے کو کہتے ہیں.

۵. آیات و روایات کے مطابق جو کوئی بھی اللہ کی اجازت سے لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرے وہ گذشتہ اور آئندہ واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے. لوح محفوظ دو قسم کے ہیں ایک میں تمام واقعات کامل صورت میں ہیں اور دوسرے میں ناقص معلومات حدود و شرائط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں.

۶. انسان کو اختیاری افعال میں مختار سمجھنے کے ساتھ ساتھ قضا و قدر پر اعتقاد رکھنا کافی دشوار ہے لہٰذا یہ مسئلہ متکلمین کی بحثوں کا محور رہا ہے لہٰذا اشاعرہ چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کے حامی تھے، جبر کے قائل ہو گئے. جب کہ معتزلہ جبر کے نقصانات سے آگاہ تھے لہٰذا اعمال انسانی میں قضائے الٰہی کی شمولیت کے منکر ہو گئے.

۷. قضاء و قدر پر اعتقاد معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

اکتیسواں سبق

قضاوقدر کا مفہوم

بیچلر B.A

تمہید

قضا وقدر پر اعتقاد کا تقاضا یہ ہے کہ موجودات کی پیدایش سے لے کر آخر عمر تک الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لایا جائے، یعنی یہ کہ ہر شی کی پیدایش کا دارومدار قضا و قدر الٰہی پر ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی شیء اپنے حدود میں موجود نہیں ہو سکتی. قضا و قدر الٰہی پر ایمان لانا توحید افعالی کا لازمہ ہے .جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ایک ہے لیکن قضا و قدر الٰہی پر اعتقاد رکھنا باوجود اس کے کہ انسان کو مختار فرض کیا جائے بہت مشکل ہے اس لئے یہ مسئلہ متکلمین کے درمیان بحث و تحیص کا مرکز رہا ہے.

تفصیل

کلمہ "قدر" کے معنی اندازہ اور کلمہ "تقدیر" کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور کسی چیز کو ایک معین اندازے و پیمانے کے مطابق تعمیر وترقی دینے کے ہیں اور کلمہ "قضا" کے معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں. کبھی یہ دونوں کلمے ایک ساتھ تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں.

تقدیر الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر شی کے لئے کم (مقدار) و کیف (حالت)، زمان و مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں، جو تدریجی اسباب و عوامل کے ذریعہ انجام پاتے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شی اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

اس تفسیر کے مطابق، مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے، اور اس کے تدریجی مراتب ہیں.

، جو قریب، متوسط اور بعید مقدمات کو شامل ہیں اور اسباب و شرائط کے بدلنے کے ساتھ یہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے ایک جنین پہلے نطفہ پھر علقہ، پھر مضغہ یہاں تک کہ ایک کامل انسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس میں زمانی و مکانی تشخصات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اب اس کا ایک مرحلہ میں ساقط ہو جانا، ,, تقدیر، میں تغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن مرحلہ قضا ایک دفعی مسئلہ ہے جو اسباب و شرائط کے فراہم ہونے پر ہی منحصر ہے اس کے بعد اس کا پایا جانا حتمی، و نا قابل تغییر ہے " إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ "[1] جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے.

---

[1]. آل عمران/۴۷

لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ کبھی قضا و قدر دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انہیں حتمی اور غیر حتمی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ روایات اور دعاؤں میں قضا کو بدلنے والے اسباب میں سے "صدقہ" ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلۂ رحم، دعا وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے.

قضاوقدر علمی و عینی

کبھی تقدیر اور قضائے الٰہی، موجودات کی پیدائش کے لئے اسباب و شرائط اور مقدمات کے فراہم ہونے کے تحت، علم خدا کہ معنی میں آیا ہے اسی طرح ان امور کے حتمی واقع ہو جانے کے سلسلہ میں بھی یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں جسے " قضا و قدر علمی " کا نام دیا جاتا ہے، اور کبھی موجودات کی پیدائش کے تدریجی مراحل اور ان کے عینی تحقق کو، خدا کی ذات سے نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جسے "قضاوقدر عینی" کا نام دیا جاتا ہے.

آیات وروایات کی روشنی میں علم الٰہی ان تمام موجودات کو شامل ہوتا ہے کہ جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب خدا کی ایک مخلوق "لوح محفوظ" میں درج ہیں، لہٰذا جو بھی خدا کی اجازت سے اس لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرلے وہ گذشتہ اور آئندہ کے واقعات سے باخبر ہوجاتا ہے، اس لوح محفوظ کے علاوہ دوسرے کم مرتبہ لوح محفوظ بھی ہیں جو واقعات کو ناقص اور حدود و شرائط کے ساتھ بیان کرتے ہیں لہٰذا جو بھی ان تک رسائی حاصل کرلے وہ واقعات کے سلسلہ میں اجمالی علم حاصل کرلیتا ہے، جو قابل تبدیل بھی ہیں، شاید یہ آیت انہی دو قسموں کی طرف اشارہ کررہی ہے " يَمحُو اللّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الكِتَٰبِ "[1] پھر اس میں میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب، لوح محفوظ موجود ہے.

سبق نمبر ۳۱

بہر حال قضا و قدر علمی کے اعتبار کے سلسلہ میں اس سے زیادہ مشکلات و دشواریاں نہیں ہیں جو ہم نے خدا کے علم ازلی ہونے کے بارے میں بیان کی ہیں، گذشتہ دروس میں علم الٰہی کے بارے میں جبریوں کے شبہات کے تحت گفتگو ہو چکی ہے اور ان کے شبہات کو کمزور اور ان کے بطلان کو واضح کیا جاچکا ہے.

---

[1]. رعد/۳۹

لیکن قضا و قدر عینی پر اعتقاد کے سلسلہ میں جو مشکل ترین اعتراضات پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات دینا ضروری ہیں اگر چہ اس بابت تاثیر استقلالی میں توحید کے مباحث کے درمیان ایک اجمالی جواب دیا جاچکا ہے.

انسان کے اختیار سے قضا و قدر کا رابطہ.

ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ قضا و قدر عینی پر اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ موجودات کی پیدائش سے کمال تک بلکہ آخر عمر تک حتی کہ الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لانا ہوگا اور پیدائش کے شرائط کے فراہم ہونے سے آخری مرحلہ تک ارادہ الٰہی سے وابستہ ہونے پر یقین کرنا ہوگا.[1]

یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس طرح ہر موجود کا خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کی طرف نسبت دینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی وجود بھی موجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر شی کی پیدائش قضا و قدر الٰہی سے وابستہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی بھی وجود اپنی حدود میں موجود نہیں رہ سکتا، لہٰذا اس نسبت کو بیان کرنا دراصل توحید کی تدریجی تعلیم یعنی تاثیر میں استقلال کے معنی میں ہے جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ہے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں توحید کی یہ قسم عظیم اثرات کی حامل ہے.

لیکن موجودات کو اذن الٰہی اور اس کی مشیت سے نسبت دینا نہایت آسان ہے، برخلاف اس کے آخری مرحلہ کے، نیز قطعی ہونے کی نسبت قضائے الٰہی کی طرف اس لئے دی جاتی ہے کہ اس میں پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ متکلمین کی بحثوں کا مرکز بنا رہا ہے، اس لئے کہ تقدیر کے بننے میں انسان کے مختار ہونے کے اعتقاد کو قبول کرنے کے ساتھ اس اعتقاد (قضاو قدر) کو ماننا اور اس پر ایمان لانا بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے متکلمین کا ایک گروہ (اشاعرہ) چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کا حامی تھا، لہٰذا جبر کا قائل ہوگیا، لیکن متکلمین کا دوسرا گروہ (معتزلہ) چونکہ جبر اور اس کے جبران ناپذیر نقصانات سے آگاہ تھا لہٰذا اسے قبول نہ کرتے ہوئے انسانی افعال میں قضائے الٰہی کی شمولیت کا منکر ہوگیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق انجام دی اور مخالف آیتوں اور روایتوں کی تاویل اور توجیہ کی ہے جسے ہم نے جبر و تفویض کے سلسلہ میں لکھے گئے مفصل رسالہ میں پیش کیا ہے.

---

[1]. ارادہ اور قضا کا ایک دوسرے پر منطبق ہونا سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۴۷ اور سورۂ یٰس کی آیت نمبر ۸۳، کی تطبیق کے ذریعہ یہ مطلب روشن ہوجاتا ہے. "اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ."

لیکن اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعاً انسان کے افعال اختیاری ہیں اور وہ اپنے ارادہ میں مختار ہے تو اسے کس طرح ارادۂ الٰہی اور اس کی قضا سے نسبت دی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس کے افعال کی قضائے الٰہی سے نسبت دی گئی ہے تو پھر کس طرح انسان سے نسبت دی جا سکتی ہے؟

لہٰذا اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے اور ان دونوں نسبتوں کو جمع کرنے کے لئے ایک علت کی طرف چند معلول کو نسبت دینے کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے تاکہ ان دونوں نسبتوں کی نوعیت معلوم ہو سکے.

متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسمیں.

ایک موجود کی پیدائش میں چند علتوں کے اثر انداز ہونے کی چند صورتیں ہیں.

۱. چند علتیں ایک ساتھ اثر انداز ہوں جیسے کہ بیج، پانی، ہوا، سورج جیسے تمام اسباب مل کر سبزہ کے اگنے کا سبب بنتے ہیں.

۲. چند علتیں نیابتاً ایک دوسرے کے بعد عمل کریں جیسے کہ ہوائی جہاز کے متعدد انجن یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہوائی جہاز برابر پرواز کرتا ہے.

۳. چند علتوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا جیسے کہ متعدد گیندوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا، یا متعدد کاروں کا ایک ساتھ اکسیڈنٹ، یا ارادہ کا ہاتھ کی حرکت پر موثر ہونا اور ہاتھ کی حرکت کا اثر انداز ہونا قلم کی حرکت پر اور قلم کی حرکت کا نتیجہ ایک نوشتہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر کا نتیجہ ہیں.

۴. متعدد عوامل کا ایک دوسرے پر موثر ہونا، جبکہ ہر ایک دوسرے سے مستقل ہو، یہ مفروضہ گذشتہ مفروضہ سے بالکل جدا ہے اس لئے کہ وہاں ہاتھ کی حرکت، ارادہ پر منحصر تھی اور قلم کی حرکت، ہاتھ کی حرکت پر منحصر تھی.

ان تمام صورتوں میں چند علتوں کے ذریعہ ایک معلول کا وجود میں آنا لازمی ہے، لہٰذا فعل اختیاری میں ارادۂ الٰہی اور انسان کے ارادے کی تاثیر اسی قسم میں سے ہے، اس لئے کہ انسان اور اس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے.

لیکن وہ صورت کہ جس میں معلول واحد پر دو علتوں کا اجتماع غیر ممکن ہے، وہ دو "ہستی بخش" (وجود آفرین) علتوں کا اجتماع ہے یا ایسی دو علتوں کا اجتماع ہے کہ جو مانعۃ الجمع، مستقل، اور ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز ہوتی ہیں، جیسے کہ ایک ارادہ دو مزید فاعلوں سے وجود میں آئے یا دو مشابہ موجود دو تامہ علتوں کا نتیجہ ہوں.

بتیسواں سبق

شبہہ کا جواب

گذشتہ تشریح کی روشنی میں انسان کے اختیاری افعال کو خدا سے نسبت دینے کے علاوہ خود انسان سے نسبت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسبتیں آپس میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں.
ایک دوسری تعبیر کے مطابق ایک فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دینا یہ ایک مرحلہ ہے اور خود اس کے وجود کو خدا کی طرف نسبت دینا اس شے سے بالاتر مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں خود انسان کا وجود اور وہ مادہ کہ جس پر وہ فعل انجام پاتا ہے اور وہ آلات جس کی مدد سے فعل واقع ہوا ہے سب کے سب اسی سے وابستہ ہیں.
پس انسان کے ارادہ کی تاثیر علت تامہ کے ایک جزء کے عنوان سے اپنے امور میں اس امر سے کوئی منافات نہیں رکھتا، کہ علت تامہ کے تمام اجزاء کو خدا سے نسبت دیدی جائے، اور وہ صرف خدا ہے جو جہان، انسان اور اس کے تمام افعال و کردار کو اپنے دست قدرت میں سنبھالے ہوئے ہے، ہمیشہ انھیں وجود عطا کرتا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک معین شکل میں خلق کرتا ہے لہٰذا کوئی موجود بھی کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور انسان کے اختیاری افعال بھی اس سے بے نیاز اور اس کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اور اس کی تمام خصوصیات، اور صفات الٰہی قضا و قدر سے وابستہ ہیں، لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ، انسان کے ارادہ سے وابستہ ہوں یا خدا کے ارادہ کے تحت ہوں. اس لئے کہ یہ دونوں ارادے، مستقل اور مانعۃ الجمع نہیں ہیں، اور اعمال کو تحقق بخشنے میں ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا ارادہ اس کے وجود کی طرح ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے، اور اسے تحقق بخشنے کے لئے خدا کے ارادہ کی ضرورت ہے. " مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبّ الْعَالَمِيْنَ "[1] اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو سارے جہان کا پالنے والا خدا چاہتا ہے.

عقیدہ قضاوقدر کے اثرات

قضا و قدر پر اعتقاد، معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل (بتدریج کامل ہونے) کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کو ہم یہاں ذکر کریں گے.

---

[1]. تکویر/۲۹

وہ اشخاص جو حوادث کی پیدائش میں ارادہ الٰہی کے مؤثر ہونے اور قضا و قدر الٰہی پر ایمان رکھتے ہوں وہ ناگوار حادثوں سے نہیں ڈرتے، اور نالہ وزاری نہیں کرتے، بلکہ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ حوادث بھی اس کے حکیمانہ ارادہ کا ایک جز ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہے لہٰذا رضاکارانہ اور والھانہ طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں، اور اس طرح صبر و رضا، تسلیم و توکل جیسی صفات کے محور بن جاتے ہیں اور دنیا کی خوشیوں اور رعنائیوں پر مغرور و سرمست نہیں ہوتے اور خدائی نعمتوں کو اپنے لئے فخر کا وسیلہ نہیں سمجھتے.

یہ وہی اثرات ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے. ''مَا اَصَابَ مِنْ مُصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلاَ فِي اَنفُسِكُم اِلاَّ فِي كِتٰبٍ مِن قَبلِ اَن نَّبرَأَهَا اِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ * لِّكَيلاَ تَأسَوا عَلَى مَافَاتَكُم وَلاَ تَفرَحُوا بِمَاءَ اتَكُم وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُختَالٍ فَخُورٍ ''[1] جتنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوئی ہیں قبل اس کے کہ ہم انھیں ظاہر کریں (لوح محفوظ) پر مکتوب ہیں بیشک یہ خدا پر آسان ہے، تاکہ جب تم سے کوئی چیز چھین لی جائے اس کا رنج نہ کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترایا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا. لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید قضا و قدر سے غلط مطلب نکالنا انتہائی سستی، کاہلی اور ذمہ داریوں سے منہ موڑنا ہے. اور ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ جاودانی سعادت و شقاوت ہمارے اختیاری افعال میں مضمر ہے.'' لَهَا مَا كَسَبَت وَ عَلَيهَا مَا اكتَسَبَت ''[2] اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لئے اور برا کام کیا تو (اس کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گا،'' وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ''.[3] اور انسان کے لئے نہیں ہے مگر یہ کہ جتنی وہ کوشش کرے .

---

[1]. حدید/۲۳،۲۲

[2]. بقرہ/۲۸۶

[3]. نجم/۳۹

خلاصہ

۱. کلمہ قدر کے معنی اندازہ اور تقدیر کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور تقدیر الٰہی کا مطلب یہ کہ خدا نے ہر شی کے لئے مقدار، حالت، زمانہ اور مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں جو اسباب و عوامل کے تابع ہیں.

۲. قضا کے لغوی معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شیء اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

۳. مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے اور یہ قریب، متوسط اور بعید مراتب میں تقسیم ہوتا ہے.

۴. قضا و قدر دو قسم کے ہیں علمی اور عینی. علمی، یعنی اسباب و شرائط، اللہ کے علم میں ہیں اور عینی، امور کے حتمی واقع ہونے کو کہتے ہیں.

۵. آیات و روایات کے مطابق جو کوئی بھی اللہ کی اجازت سے لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرے وہ گذشتہ اور آئندہ واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے. لوح محفوظ دو قسم کے ہیں ایک میں تمام واقعات کامل صورت میں ہیں اور دوسرے میں ناقص معلومات حدود و شرائط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں.

۶. انسان کو اختیاری افعال میں مختار سمجھنے کے ساتھ ساتھ قضا و قدر پر اعتقاد رکھنا کافی دشوار ہے لہٰذا یہ مسئلہ متکلمین کی بحثوں کا محور رہا ہے لہٰذا اشاعرہ چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کے حامی تھے، جبر کے قائل ہو گئے. جب کہ معتزلہ جبر کے نقصانات سے آگاہ تھے لہٰذا اعمال انسانی میں قضائے الٰہی کی شمولیت کے منکر ہو گئے.

۷. قضاء و قدر پر اعتقاد معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

بتیسواں سبق

قضاوقدر کا مفہوم

بیچلر B.A

تمہید

قضا وقدر پر اعتقاد کا تقاضا یہ ہے کہ موجودات کی پیدایش سے لے کر آخر عمر تک الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لایا جائے، یعنی یہ کہ ہر شی کی پیدایش کا دارومدار قضا و قدر الٰہی پر ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی شیء اپنے حدود میں موجود نہیں ہو سکتی. قضا و قدر الٰہی پر ایمان لانا توحید افعالی کا لازمہ ہے .جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ایک ہے لیکن قضا و قدر الٰہی پر اعتقاد رکھنا باوجود اس کے کہ انسان کو مختار فرض کیا جائے بہت مشکل ہے اس لئے یہ مسئلہ متکلمین کے درمیان بحث و تحیص کا مرکز رہا ہے.

تفصیل

کلمہ "قدر" کے معنی اندازہ اور کلمہ "تقدیر" کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور کسی چیز کو ایک معین اندازے و پیمانے کے مطابق تعمیر وترقی دینے کے ہیں اور کلمہ "قضا" کے معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں. کبھی یہ دونوں کلمے ایک ساتھ تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں.

تقدیر الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر شی کے لئے کم (مقدار) و کیف (حالت)، زمان و مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں، جو تدریجی اسباب و عوامل کے ذریعہ انجام پاتے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شی اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

اس تفسیر کے مطابق، مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے، اور اس کے تدریجی مراتب ہیں.

، جو قریب، متوسط اور بعید مقدمات کو شامل ہیں اور اسباب و شرائط کے بدلنے کے ساتھ یہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے ایک جنین پہلے نطفہ پھر علقہ، پھر مضغہ یہاں تک کہ ایک کامل انسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس میں زمانی و مکانی تشخصات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اب اس کا ایک مرحلہ میں ساقط ہو جانا، ,, تقدیر، میں تغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن مرحلہ قضا ایک دفعی مسئلہ ہے جو اسباب و شرائط کے فراہم ہونے پر ہی منحصر ہے اس کے بعد اس کا پایا جانا حتمی، و نا قابل تغییر ہے " إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ "[1] جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے.

---

[1]. آل عمران/۴۷

لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ کبھی قضا و قدر دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انہیں حتمی اور غیر حتمی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ روایات اور دعاؤں میں قضا کو بدلنے والے اسباب میں سے "صدقہ" ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلۂ رحم، دعا وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے.

قضاوقدر علمی و عینی

کبھی تقدیر اور قضائے الٰہی، موجودات کی پیدائش کے لئے اسباب و شرائط اور مقدمات کے فراہم ہونے کے تحت، علم خدا کہ معنی میں آیا ہے اسی طرح ان امور کے حتمی واقع ہو جانے کے سلسلہ میں بھی یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں جسے " قضا و قدر علمی " کا نام دیا جاتا ہے، اور کبھی موجودات کی پیدائش کے تدریجی مراحل اور ان کے عینی تحقق کو، خدا کی ذات سے نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جسے "قضاو قدر عینی" کا نام دیا جاتا ہے.

آیات و روایات کی روشنی میں علم الٰہی ان تمام موجودات کو شامل ہوتا ہے کہ جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب خدا کی ایک مخلوق "لوح محفوظ" میں درج ہیں، لہٰذا جو بھی خدا کی اجازت سے اس لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرلے وہ گذشتہ اور آئندہ کے واقعات سے باخبر ہوجاتا ہے، اس لوح محفوظ کے علاوہ دوسرے کم مرتبہ لوح محفوظ بھی ہیں جو واقعات کو ناقص اور حدود و شرائط کے ساتھ بیان کرتے ہیں لہٰذا جو بھی ان تک رسائی حاصل کرلے وہ واقعات کے سلسلہ میں اجمالی علم حاصل کرلیتا ہے، جو قابل تبدیل بھی ہیں، شاید یہ آیت انہی دو قسموں کی طرف اشارہ کررہی ہے " يَمحُو اللّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الكِتَٰبِ "[1] پھر اس میں میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب، لوح محفوظ موجود ہے.

سبق نمبر ۳۱

بہر حال قضا و قدر علمی کے اعتبار کے سلسلہ میں اس سے زیادہ مشکلات و دشواریاں نہیں ہیں جو ہم نے خدا کے علم ازلی ہونے کے بارے میں بیان کی ہیں، گذشتہ دروس میں علم الٰہی کے بارے میں جبریوں کے شبہات کے تحت گفتگو ہو چکی ہے اور ان کے شبہات کو کمزور اور ان کے بطلان کو واضح کیا جاچکا ہے.

---

[1]. رعد/۳۹

لیکن قضا و قدر عینی پر اعتقاد کے سلسلہ میں جو مشکل ترین اعتراضات پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات دینا ضروری ہیں اگر چہ اس بابت تاثیر استقلالی میں توحید کے مباحث کے درمیان ایک اجمالی جواب دیا جاچکا ہے.

انسان کے اختیار سے قضا و قدر کا رابطہ.

ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ قضا و قدر عینی پر اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ موجودات کی پیدائش سے کمال تک بلکہ آخر عمر تک حتی کہ الٰہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لانا ہوگا اور پیدائش کے شرائط کے فراہم ہونے سے آخری مرحلہ تک ارادہ الٰہی سے وابستہ ہونے پر یقین کرنا ہوگا.[1]

یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس طرح ہر موجود کا خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کی طرف نسبت دینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی وجود بھی موجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر شی کی پیدائش قضا و قدر الٰہی سے وابستہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی بھی وجود اپنی حدود میں موجود نہیں رہ سکتا، لہٰذا اس نسبت کو بیان کرنا دراصل توحید کی تدریجی تعلیم یعنی تاثیر میں استقلال کے معنی میں ہے جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ہے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں توحید کی یہ قسم عظیم اثرات کی حامل ہے.

لیکن موجودات کو اذن الٰہی اور اس کی مشیت سے نسبت دینا نہایت آسان ہے، برخلاف اس کے آخری مرحلہ کے، نیز قطعی ہونے کی نسبت قضائے الٰہی کی طرف اس لئے دی جاتی ہے کہ اس میں پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ متکلمین کی بحثوں کا مرکز بنا رہا ہے، اس لئے کہ تقدیر کے بننے میں انسان کے مختار ہونے کے اعتقاد کو قبول کرنے کے ساتھ اس اعتقاد (قضاو قدر) کو ماننا اور اس پر ایمان لانا بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے متکلمین کا ایک گروہ (اشاعرہ) چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کا حامی تھا، لہٰذا جبر کا قائل ہوگیا، لیکن متکلمین کا دوسرا گروہ (معتزلہ) چونکہ جبر اور اس کے جبران ناپذیر نقصانات سے آگاہ تھا لہٰذا اسے قبول نہ کرتے ہوئے انسانی افعال میں قضائے الٰہی کی شمولیت کا منکر ہوگیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق انجام دی اور مخالف آیتوں اور روایتوں کی تاویل اور توجیہ کی ہے جسے ہم نے جبر و تفویض کے سلسلہ میں لکھے گئے مفصل رسالہ میں پیش کیا ہے.

---

[1]. ارادہ اور قضا کا ایک دوسرے پر منطبق ہونا سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۴۷ اور سورۂ یٰس کی آیت نمبر ۸۳، کی تطبیق کے ذریعہ یہ مطلب روشن ہوجاتا ہے. "اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ."

لیکن اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعاً انسان کے افعال اختیاری ہیں اور وہ اپنے ارادہ میں مختار ہے تو اسے کس طرح ارادۂ الٰہی اور اس کی قضا سے نسبت دی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس کے افعال کی قضائے الٰہی سے نسبت دی گئی ہے تو پھر کس طرح انسان سے نسبت دی جا سکتی ہے؟

لہٰذا اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے اور ان دونوں نسبتوں کو جمع کرنے کے لئے ایک علت کی طرف چند معلول کو نسبت دینے کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے تاکہ ان دونوں نسبتوں کی نوعیت معلوم ہو سکے.

متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسمیں.

ایک موجود کی پیدائش میں چند علتوں کے اثر انداز ہونے کی چند صورتیں ہیں.

۱. چند علتیں ایک ساتھ اثر انداز ہوں جیسے کہ بیج، پانی، ہوا، سورج جیسے تمام اسباب مل کر سبزہ کے اگنے کا سبب بنتے ہیں.

۲. چند علتیں نیابتاً ایک دوسرے کے بعد عمل کریں جیسے کہ ہوائی جہاز کے متعدد انجن یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہوائی جہاز برابر پرواز کرتا ہے.

۳. چند علتوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا جیسے کہ متعدد گیندوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا، یا متعدد کاروں کا ایک ساتھ اکسیڈنٹ، یا ارادہ کا ہاتھ کی حرکت پر موثر ہونا اور ہاتھ کی حرکت کا اثر انداز ہونا قلم کی حرکت پر اور قلم کی حرکت کا نتیجہ ایک نوشتہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر کا نتیجہ ہیں.

۴. متعدد عوامل کا ایک دوسرے پر موثر ہونا، جبکہ ہر ایک دوسرے سے مستقل ہو، یہ مفروضہ گذشتہ مفروضہ سے بالکل جدا ہے اس لئے کہ وہاں ہاتھ کی حرکت، ارادہ پر منحصر تھی اور قلم کی حرکت، ہاتھ کی حرکت پر منحصر تھی.

ان تمام صورتوں میں چند علتوں کے ذریعہ ایک معلول کا وجود میں آنا لازمی ہے، لہٰذا فعل اختیاری میں ارادۂ الٰہی اور انسان کے ارادے کی تاثیر اسی قسم میں سے ہے، اس لئے کہ انسان اور اس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے.

لیکن وہ صورت کہ جس میں معلول واحد پر دو علتوں کا اجتماع غیر ممکن ہے، وہ دو "ہستی بخش" (وجود آفرین) علتوں کا اجتماع ہے یا ایسی دو علتوں کا اجتماع ہے کہ جو مانعۃ الجمع، مستقل، اور ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز ہوتی ہیں، جیسے کہ ایک ارادہ دو مزید فاعلوں سے وجود میں آئے یا دو مشابہ موجود دو تامہ علتوں کا نتیجہ ہوں.

بتیسواں سبق

شبہہ کا جواب

گذشتہ تشریح کی روشنی میں انسان کے اختیاری افعال کو خدا سے نسبت دینے کے علاوہ خود انسان سے نسبت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسبتیں آپس میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں.
ایک دوسری تعبیر کے مطابق ایک فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دینا یہ ایک مرحلہ ہے اور خود اس کے وجود کو خدا کی طرف نسبت دینا اس شے سے بالاتر مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں خود انسان کا وجود اور وہ مادہ کہ جس پر وہ فعل انجام پاتا ہے اور وہ آلات جس کی مدد سے فعل واقع ہوا ہے سب کے سب اسی سے وابستہ ہیں.
پس انسان کے ارادہ کی تاثیر علت تامہ کے ایک جزء کے عنوان سے اپنے امور میں اس امر سے کوئی منافات نہیں رکھتا، کہ علت تامہ کے تمام اجزاء کو خدا سے نسبت دیدی جائے، اور وہ صرف خدا ہے جو جہان، انسان اور اس کے تمام افعال و کردار کو اپنے دست قدرت میں سنبھالے ہوئے ہے، ہمیشہ انھیں وجود عطا کرتا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک معین شکل میں خلق کرتا ہے لہٰذا کوئی موجود بھی کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور انسان کے اختیاری افعال بھی اس سے بے نیاز اور اس کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اور اس کی تمام خصوصیات، اور صفات الٰہی قضا و قدر سے وابستہ ہیں، لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ، انسان کے ارادہ سے وابستہ ہوں یا خدا کے ارادہ کے تحت ہوں. اس لئے کہ یہ دونوں ارادے، مستقل اور مانعۃ الجمع نہیں ہیں، اور اعمال کو تحقق بخشنے میں ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا ارادہ اس کے وجود کی طرح ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے، اور اسے تحقق بخشنے کے لئے خدا کے ارادہ کی ضرورت ہے. " مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبّ الْعَالَمِيْنَ "[1] اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو سارے جہان کا پالنے والا خدا چاہتا ہے.

عقیدہ قضاوقدر کے اثرات

قضا و قدر پر اعتقاد، معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل (بتدریج کامل ہونے) کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کو ہم یہاں ذکر کریں گے.

---

[1]. تکویر/۲۹

وہ اشخاص جو حوادث کی پیدائش میں ارادہ الٰہی کے مؤثر ہونے اور قضا و قدر الٰھی پر ایمان رکھتے ہوں وہ ناگوار حادثوں سے نہیں ڈرتے، اور نالہ وزاری نہیں کرتے، بلکہ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ حوادث بھی اس کے حکیمانہ ارادہ کا ایک جز ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہے لہٰذا رضاکارانہ اور والھانہ طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں، اور اس طرح صبر و رضا، تسلیم و توکل جیسی صفات کے محور بن جاتے ہیں اور دنیا کی خوشیوں اور رعنائیوں پر مغرور و سرمست نہیں ہوتے اور خدائی نعمتوں کو اپنے لئے فخر کا وسیلہ نہیں سمجھتے.

یہ وہی اثرات ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے. ''مَا اَصَابَ مِنْ مُصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلاَ فِي اَنفُسِكُم اِلاَّ فِي كِتٰبٍ مِن قَبلِ اَن نَّبرَأَهَا اِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ * لِّكَيلاَ تَأسَوا عَلَى مَافَاتَكُم وَلاَ تَفرَحُوا بِمَاءَ اتَكُم وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُختَالٍ فَخُورٍ ''[1] جتنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوئی ہیں قبل اس کے کہ ہم انھیں ظاہر کریں (لوح محفوظ) پر مکتوب ہیں بیشک یہ خدا پر آسان ہے، تاکہ جب تم سے کوئی چیز چھین لی جائے اس کا رنج نہ کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترایا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا. لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید قضا و قدر سے غلط مطلب نکالنا انتہائی سستی، کاہلی اور ذمہ داریوں سے منہ موڑنا ہے. اور ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ جاودانی سعادت و شقاوت ہمارے اختیاری افعال میں مضمر ہے.'' لَهَا مَا كَسَبَت وَ عَلَيهَا مَا اكتَسَبَت ''[2] اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لئے اور برا کام کیا تو (اس کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گا،'' وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ''.[3] اور انسان کے لئے نہیں ہے مگر یہ کہ جتنی وہ کوشش کرے .

---

[1]. حدید/۲۳،۲۲

[2]. بقرہ/۲۸۶

[3]. نجم/۳۹

خلاصہ

۱. کلمہ قدر کے معنی اندازہ اور تقدیر کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور تقدیر الٰہی کا مطلب یہ کہ خدا نے ہر شی کے لئے مقدار، حالت، زمانہ اور مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دیے ہیں جو اسباب و عوامل کے تابع ہیں.

۲. قضا کے لغوی معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں اور قضائے الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شیء اپنے اختتام تک پہنچ جائے.

۳. مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے اور یہ قریب، متوسط اور بعید مراتب میں تقسیم ہوتا ہے.

۴. قضا و قدر دو قسم کے ہیں علمی اور عینی. علمی، یعنی اسباب و شرائط، اللہ کے علم میں ہیں اور عینی، امور کے حتمی واقع ہونے کو کہتے ہیں.

۵. آیات و روایات کے مطابق جو کوئی بھی اللہ کی اجازت سے لوح محفوظ تک رسائی حاصل کرے وہ گذشتہ اور آئندہ واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے. لوح محفوظ دو قسم کے ہیں ایک میں تمام واقعات کامل صورت میں ہیں اور دوسرے میں ناقص معلومات حدود و شرائط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں.

۶. انسان کو اختیاری افعال میں مختار سمجھنے کے ساتھ ساتھ قضا و قدر پر اعتقاد رکھنا کافی دشوار ہے لہٰذا یہ مسئلہ متکلمین کی بحثوں کا محور رہا ہے لہٰذا اشاعرہ چونکہ انسانی اعمال میں قضائے الٰہی کے انتساب کے حامی تھے، جبر کے قائل ہو گئے. جب کہ معتزلہ جبر کے نقصانات سے آگاہ تھے لہٰذا اعمال انسانی میں قضائے الٰہی کی شمولیت کے منکر ہو گئے.

۷. قضاء و قدر پر اعتقاد معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

تینتیسواں سبق

عدل الٰہی

بیچلر B.A

تمہید

اصول دین کی ایک اصل عدل الٰہی ہے. عدل الٰہی اشعری اور معتزلی متکلمین کے درمیان بنیادی اختلافی مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ہے. عدل الٰہی تو اصول دین میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کیونکہ عدل الٰہی ایک طرف سے قیامت سے مربوط ہے تو دوسری طرف جزاو سزا سے.

اس کے علاوہ اجتماعی و اخلاقی اور تربیتی مسائل کا دارومدار بھی عدل الٰہی کے انکار یا اقرار پر ہے. ہم اس سبق میں عدل کے مفہوم اور اس کے دلائل بیان کریں گے اور آخر میں اسی حوالے سے بیان کیے گئے اعتراضات کے جوابات بھی دیں گے.

تفصیل

ہم نے سابقہ سبق میں متکلمین کے دو گروہوں (اشعری اور معتزلی) کے کلامی نظریات، ارادہ الٰہی، توحید، جبر و اختیار، قضا و قدر کے سلسلہ میں گفتگو کی کہ جن میں وہ حد اعتدال سے آگے بڑھ گئے اور من گھڑت قسم کے نظریات اپنا لیے.

انہی دو گروہوں کے درمیان بنیادی اختلاف میں سے ایک عدل الٰہی کا مسئلہ ہے، اس نظریہ میں شیعہ متکلمین، معتزلہ کے موافق ہیں جنھیں اشاعرہ کے مقابلے میں عدلیہ کہا جاتا ہے، اور یہ مسئلہ اپنی اہمیت کی وجہ سے علم کلام کے بنیادی و اساسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس مسئلہ کو اصول عقائد کا ایک حصہ اور شیعہ و معتزلہ متکلمین کی پہچان کے عنوان سے جانا گیا ہے.

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اشاعرہ عدل الٰہی کے منکر نہیں ہیں، اور ایسا ہر گز نہیں ہے کہ وہ (**العیاذ باللہ**) خدا کو ظالم سمجھتے ہوں، اس لئے کہ قرآن کی آیات واضح انداز میں عدل الٰہی کے اثبات اور اس سے ہر طرح کے ظلم کی نفی کرتی ہیں، لیکن اصل اختلاف یہ ہے کہ کیا عقل، شرعی بیانات (کتاب و سنت) سے ہٹ کر خدا کے افعال کے لئے قوانین کا ادراک کر سکتی ہے، اور اس طرح کسی عمل کے انجام دینے یا اسے ترک کرنے کا حکم دے سکتی ہے، مثلاً کیا "خدا کے لئے لازم ہے کہ مومنوں کو بہشت اور کافروں کو دوزخ میں لے جائے" کیا عقل اسکا حکم دے سکتی ہے، یا پھر ایسے قضایا کا حل صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے اور عقل کی ایسے مسائل میں دخل اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے؟

لہٰذا اختلاف کا محوری نقطہ (حُسن و قبح عقلی) کا مسئلہ ہے جس سے اشاعرہ نے انکار کیا ہے اور وہ قائل ہیں کہ تکوینی امور میں جو خدا کا فرمان ہے وہی بہتر ہے، اور (تشریعی امور) میں صرف اسی کا حکم اچھا اور بہتر ہے، اور ایسا ہر گز نہیں ہے کہ وہ نیک کام ہے لہٰذا اسے انجام دینے کا حکم دیا جائے یا برا کام ہے لہٰذا اس سے روکا جائے.

لیکن عدلیہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ تکوینی اور تشریعی مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے افعال خدا کو (حُسن و قبح) سے متصل کیا جا سکتا ہے، اور عقل بھی ایک حد تک افعال کے برے یا اچھے ہونے کے اسباب کا پتا لگا سکتی ہے اور وجود مقدس الٰہی کو افعال قبیحہ سے منزہ کر سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل خدا کو (**العیاذ باالله**) نیک امور کا حکم دے یا برے امور سے منع کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل ذات خداوندی سے افعال قبیحہ کے صدور کو محال جانتی ہے نیز ذات الٰہی اور افعال حسنہ یا قبیحہ کے درمیان نسبتوں کا اندازہ لگا سکتی ہے.

یہ بات آشکار ہے کہ ان مباحث کی تفصیلی تحقیق اور اس ضمن میں شبہات کا جواب جس میں اشاعرہ کی طرف سے (حُسن و قبح) عقلی کا انکار کیا گیا ہے اور انھیں جماعت عدلیہ کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے تحت معتزلہ کے بعض نظریات ضعیف ہوں کہ جن کی ہم مناسب موقع پر وضاحت کریں گے، لیکن یہ حُسن و قبح عقلی کا مسئلہ شیعوں کے نزدیک قابل قبول اور کتاب و سنت کی طرف سے تائید کے علاوہ، معصومین علیہم السلام نے اس کے اثبات میں بڑی تاکید کی ہے.

اسی وجہ سے ہم یہاں پر مفہوم عدل کے تحت تھوڑی وضاحت کریں گے، اور چونکہ یہ خدا کی صفاتِ فعلیہ ہیں لہٰذا اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے اس ضمن میں موجودہ شبہات کے سلسلہ میں بحث کریں گے.

مفہوم عدل

عدل کے لغوی معنی برابری اور مساوی کرنے کے ہیں، اور عرف عام میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنے کے معنی میں ہے. جسے دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے پس عدل کی اس طرح تعریف کی جا سکتی ہے " **اِعطَاءُ کُلّ ذِي حَقٍ حَقَّهُ** "صاحب حق کے حق کو عطا کرنا لہٰذا اس تعریف کے تحت ایک ایسے موجود کو فرض کرنا ہوگا جو صاحب حق ہو، تاکہ اس کی رعایت کو عدل اور اس پر تجاوز کو ظلم کا نام دیا جا سکے لیکن کبھی مفہوم عدل کو وسعت دیتے ہوئے اس طرح تعریف کی جاتی ہے، کہ (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا اور کسی بھی فعل کو شائستہ صورت میں انجام دینا) اور پھر اس طرح عدل کی تعریف "**وضع کل شيءٍ في موضعه**" (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا) کی جا سکتی ہے، عدل کی یہ تعریف حکمت کے مساوی اور ایک

عادلانہ حکیمانہ عمل کا مساوی کہلائے گی. لیکن کسی طرح (صاحب حق کا حق) کسی بھی شئی کا اپنا مقام معین ہو، اس سلسلہ میں کافی بحث ہے جس نے فلسفہ اور کلام کے عظیم مباحث کو اپنے سے مخصوص کر لیا ہے جنھیں ہم یہاں پر کسی بھی صورت میں بیان نہیں کر سکتے.

لیکن جس مسئلہ کی طرف توجہ لازمی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام عقلا اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یتیم کے منہ سے لقمہ کو چھیننا یا ناحق کسی کا خون بہانا، ایک قبیح عمل ہے، یا یتیم کے دہن سے چھینا گیا لقمہ اس کے منہ میں لوٹا دینا یا ناحق خون بہانے والے کو سزا دینا ایک عادلانہ اور شائستہ عمل ہے، اور یہ امر خدا کے امر و نہی پر منحصر نہیں ہے یہاں تک کہ ایک ملحد بھی اپنے مقام پر یہی قضاوت کرتا ہے لیکن اس فیصلہ کا راز کیا ہے؟ اور کون سی طاقت حسن و قبح کے تعین کی صلاحیت رکھتی ہے اسی طرح کے اور دوسرے مسائل کے بارے میں فلسفہ کی کتابوں میں بحث کی جاتی رہی ہے.

چونتیسواں سبق

نتیجہ. عدل کے لئے دو مفہوم خاص اور عام فرض کیے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا، اور دوسرے یہ کہ حکیمانہ عمل انجام دینا، کہ جس میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے.

لہٰذا عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے جیسے کہ عادل استاد وہ نہیں ہے جو محنتی اور کاہل شاگردوں کو برابر سے تشویق یا انھیں مساوی حثیت سے سزا دے، یا عادل قاضی وہ نہیں ہے جو مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مورد نزاع مال کو مساوی تقسیم کر دے، بلکہ عادل استاد وہ ہے جو ہر شاگرد کو اس کی شائستگی کے مطابق تشویق یا اس کی کاھلی کے اعتبار سے اسے سزا دے، اور عادل قاضی وہ ہے جو مال کو اس کے مالک کے حوالہ کر دے.

اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ تمام مخلوقات کو ایک جیسا خلق کرے، جیسے کہ پرندوں کی طرح انسان کو بھی بال و پر عطا کرے بلکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ جہان کو اسی صورت میں خلق کرے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ خیر و کمال مل سکے، اور مختلف موجودات کو ان کے انتہائی ہدف کے مطابق خلق کرے اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی استعداد کے مطابق عمل انجام دینے کا حکم دے. ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلاَّ وُسعَھَا''[1] اور پھر اس کی استعداد اور توانائی کے مطابق قضاوت کرے. ''وَقُضِیَ بَینَھُم بِالقِسطِ وَھُم

[1]. بقرہ/۲۸۶

لاَ یُظلَمُون ' '[1] اور اس کے عمل کے عوض میں سزا، یا جزا عطا کرے. '' فَالیَومَ لاَ تُظلَمُ نَفسٌ شَیئاً وَلاَ تُجزَونَ اِلَّا مَاکُنتُم تَعمَلُونَ ''[2].

دلیل عدل الٰہی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ عدل ایک تعریف کے مطابق حکمت الٰہی کا حصہ اور دوسری تعریف کے مطابق عین حکمت الٰہی ہے، لہٰذا اس کے اثبات میں دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے جو حکمت الٰہی کو ثابت کر سکے، جس کے بارے میں گیارہویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، یہاں پر مزید اس کی وضاحت کی جا رہی ہے.

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا بے نہایت قدرت و اختیار کا مالک ہے اور تمام ممکن الوجود امور اسی کی قدرت میں ہیں، اور کسی بھی خارجی طاقت کے سامنے تسلیم اور مغلوب ہوئے بغیر امور کی انجام دہی یا انھیں ترک کرنے پر قادر ہے، لیکن ہر وہ فعل جسے انجام دے سکتا ہے انجام نہیں دیتا بلکہ جس کے لئے ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے.

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ بے حساب و کتاب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ اپنے صفات کمالیہ کے مطابق ارادہ کرتا ہے، اور اگر اس کے صفات کمالیہ کسی فعل کا تقاضا نہ رکھتے ہوں تو وہ کبھی بھی اسے انجام نہیں دیتا، چونکہ ذات خداوند کمالِ محض ہے، لہٰذا اس کا ارادہ بھی مخلوقات کے کمال اور ان کے خیر سے متعلق ہوتا ہے، اور اگر کسی مخلوق کے وجود کا لازمہ، جہان میں نقائص کی پیدائش کا سبب ہو تو اس کے نقائص مقصود بالتبع ہوں گے.

یعنی اس لئے کہ وہ خیر فراواں ناقابل انفکاک (شر) کا لازمہ ہے، لہٰذا اس خیر غالب سے ارادہ الٰہی متعلق ہوگا.

پس الٰہی صفات کمالیہ کا اقتضا یہ ہے کہ جہان اس طرح خلق ہو کہ جو مجموعاً زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سرچشمہ بن سکے لہٰذا یہیں سے خدا کے لئے صفات کمالیہ ثابت ہو جاتے ہیں اسی بنیاد پر ارادۂ الٰہی اسی انسان کی خلقت سے متعلق ہوتا ہے کہ جس میں امکان موجود ہو اور "خیر و برکت کا منشا ہو، اور انسان کے امتیازات میں سے اس کا مختار ہونا اور ارادہ کے اعتبار سے آزاد ہونا ہے، بے شک اختیار و انتخاب کی طاقت سے متصف ہونا کمالات وجودی میں سے شمار کیا جاتا ہے، لیکن انسان کے مختار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نیک امور انجام دے، اور اپنے انتہائی کمال کی جانب قدم بڑھاتا رہے، اور اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ناپسند اور بُرے امور سے اپنے آپ کو بچالے تاکہ شقاوت جاودانی اور خسران عظیم سے محفوظ رہ سکے، البتہ وہ امر جو تنہا ارادہ الٰہی سے متعلق ہوتا ہے وہ صرف تکامل ہے

---

[1]. یونس/۵۴

[2]. یس/۵۴

لیکن چونکہ انسان کے تکاملِ اختیاری کے لازمہ کے ساتھ امکانِ سقوط بھی ہے، جو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ایسا سقوط اختیاری بھی بالتبع ارادہ الٰہی سے متعلق ہوگا.

اور چونکہ صحیح انتخاب خیر و شر کی راہوں کی صحیح شناخت کا محتاج ہے، لہٰذا خدا نے انسان کو انھیں امور کے انجام دینے کا حکم دیا ہے جن میں زیادہ سے زیادہ خیر و مصلحت ہو اسی طرح تباہی و بربادی کے عوامل سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے، تاکہ اس طرح اس کے تکامل کا وسیلہ فراہم ہو جائے اور چونکہ تکالیف اور احکام اس لئے وضع ہوئے ہیں تاکہ انسان ان پر عمل کرتے ہوئے مفید نتائج تک پہنچ سکے کہ جس میں خدا کے لئے نہ کوئی نفع ہے اور نہ ہی نقصان، اس وجہ سے حکم الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ احکام مکلفین کی طاقت کے مطابق ہوں اس لئے کہ وہ احکام جن پر عمل نہیں کیا جا سکتا وہ بے فائدہ اور لغو ہیں.

پس اس طرح عدل کا پہلا مرحلہ (اپنے خاص معنی میں) یعنی مقام تکلیف میں عدالت اس دلیل سے ثابت ہے کہ اگر خدا بندوں کی طاقت سے ماوراء ان پر کوئی حکم نافذ کرے تو وہ چونکہ امکان عمل سے باہر ہے لہٰذا ایک بے فائدہ عمل کہلائے گا.

لیکن بندوں کے درمیان فیصلہ میں عدالت کا مسئلہ اس نکتہ کی طرف توجہ دینے کے ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے تاکہ سزا و جزا کے اعتبار سے انسان مشخص ہو سکے، لہٰذا اگر ایسی صورت میں خدا نے عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو نقص غرض لازم آئیگی.

آخر کار سزا اور جزا دینے کا مقصد مقام عدالت ہدفِ خلقت کے پیش نظر ثابت ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس نے انسان کو اچھے اور برے امور کے نتائج تک رسائی کے لئے خلق کیا ہے اگر انھیں اس ہدف کے خلاف سزا یا جزا دینا چاہے تو وہ کبھی بھی اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکتا.

لہٰذا تمام مظاہر کے درمیان عدل الٰہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور عادلانہ اعمال کا سبب ہیں اور ایسی کوئی صفت بھی اس کی ذات میں نہیں پائی جاتی جس میں ظلم و ستم یا عبث ہونے کا شائبہ پایا جاتا ہو.

پینتیسواں سبق

چند اعتراضات کا جواب

۱. مخلوقات کے درمیان خصوصاً انسانوں میں موجود اختلافات عدل الٰہی سے کس طرح سازگار ہیں؟ اور کیوں خدا نے اپنی تمام مخلوقات کو یکساں خلق نہیں کیا؟

جواب : اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات کے درمیان خلقت کے اعتبار سے موجودہ اختلافات نظام خلقت اور اس پر حاکم قانونِ علت و معلول کا لازمہ ہیں تمام مخلوقات کا اپنی خلقت میں یکساں ہونا ایک خام خیالی ہے اگر اس سلسلہ میں ہم تھوڑا بھی غور کر لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ فرض ترک خلقت کے مساوی ہے اس لئے کہ اگر تمام مخلوقات مرد یا عورت ہوتے تو نسل آگے بڑھ نہیں سکتی تھی اور انسانی نسل کا خاتمہ ہو جاتا، اسی طرح اگر تمام مخلوقات انسان ہوتی تو انھیں اپنی احتیاجات کو بر طرف کرنے کے لئے کوئی چیز باقی رہ نہ جاتی اس کے علاوہ اگر تمام حیوانات یا نباتات ایک ہی جیسے اور ایک ہی رنگ سے سرفراز ہوتے تو ایسے دلکش مناظر کے علاوہ مختلف فوائد کا وجود نہ ہوتا، موجودات کا مختلف اشکال میں پیدا ہونا مادہ کے تغیرات کا نتیجہ ہے، اور خلقت سے پہلے کسی کا کوئی بھی حق خدا کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ اسے کیسے اور کس شکل میں خلق کرے، کہاں قرار دے، کس مقام میں اتارے، تاکہ اس طرح عدل قائم رہے اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے.

۲. اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس جہان میں خلق کرے، تو پھر اسے موت کیوں دیتا ہے اور کیوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ

پہلے تو یہ : اس جہان میں موجودات کی زندگی اور موت قوانین تکوینی اور علت و معلول روابط کی وجہ سے ہے، اور یہی نظام خلقت کا لازمہ بھی ہے

دوسرے یہ کہ : اگر زندہ موجودات نہیں مرتے اور باقی رہ جاتے تو آئندہ مخلوقات کے لئے خلقت کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا اور وہ وجود و حیات کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے.

تیسرے یہ کہ : اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام انسان خلقت کے بعد ہمیشہ زندہ رہیں تو چند ہی سال کے اندر یہ زمین انسانوں کے لئے تنگ ہو جاتی اور لوگ رنج والم اور تنگی کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے لگتے.

چوتھے یہ کہ: انسان کی خلقت کا اصل ہدف کمال تک پہنچنا ہے اور جب تک انسان موت کے ذریعہ اس جہان سے جہانِ ابدی میں منتقل نہیں ہوتا اس وقت تک اپنے انتہائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا.

۳. یہ اس زمین پر بے شمار طبیعی بلاؤں اور رنج والم (جیسے زلزلہ سیلاب وغیرہ) اور اجتماعی مشکلات جیسے جنگ ،جدال) کیونکر عدل الٰہی سے سازگار ہیں؟

سب سے پہلے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے ناگوار حوادث کا وجود مادی تغیرات کا نتیجہ ہے اور جبکہ اس کی حکمت ان کے عیوب پر غالب ہے لہٰذا یہ کسی بھی حال میں مخالف حکمت نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ اجتماعی مشکلات کا اٹھنا انسان کے مختار ہونے کا لازمہ ہے جو حکمت الٰہی کا تقاضا ہے اور زندگی کے مصالح اس کے مفاسد سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ اگر صرف مفاسد ہی مفاسد ہوتے تو اس زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہتا.

دوسرے یہ کہ، ایک طرف بے شمار رنج وزحمت کا ہونا اسرار طبیعت کو کشف کرنے کے لئے انسانوں کی حرکت کا سبب اور مختلف علوم وفنون کے ایجاد کا انگیزہ ہے اور دوسری سختیوں سے نبرد آزمانا، نیز اس سے مقابلہ کرنا انسانی صلاحیتوں کو پر ثمر بنانے کے لئے اور راہ تکامل کو طے کرنے کے لئے ایک زبردست عامل ہے اس کے علاوہ اس جہان میں اگر سختیوں کو تحمل کرنا نیتِ خیر کے ساتھ ہو تو جہانِ ابدی میں عظیم نعمات سے سرفرازی کا سبب ہے.

۴. اس زمین پر ہونے والے محدود گناہوں کی سزا عذاب ابدی کی شکل میں کیونکر عدالت سے سازگار ہے؟

جواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نیک اور بد اعمال کے درمیان، اور اخروی سزا وجزا کے درمیان ایک قسم کا رابطۂ علیت پایا جاتا ہے جسے وحی الٰہی کے ذریعہ لوگوں کو سنا دیا گیا ہے اور جس طرح اس جہان میں بعض حوادث واشرار، طولانی آثار کا سبب بنتے ہیں جیسے کہ انسان کا اپنی یا دوسروں کی آنکھوں کو پھوڑ دینا ایک لحظہ کا عمل ہے لیکن اس کے آثار یعنی نابینائی آخر عمر تک باقی رہتی ہے اس طرح بڑے بڑے گناہ آخرت میں ابدی آثار سے متصف ہیں، لہٰذا اگر کوئی اس جہان میں انھیں ان کی تلافی نہ کرے (جیسے کہ توبہ نہ کرے) تو اس کے برے آثار ابد تک، اس کے دامن پر رہیں گے، جس طرح انسانوں کا آخری عمر تک اندھا رہنا تنہا اور تنہا ایک لحظہ کی شرارات کا نتیجہ ہے، اور عدل الٰہی سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اسی طرح گناہوں کے نتیجہ میں عذاب ابدی میں گرفتار ہونا، عدل الٰہی سے منافات نہیں رکھتا، اس لئے کہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، وہ ان گناہوں کا نتیجہ ہے، جسے اس نے جانتے ہوئے انجام دیا ہے.

خلاصہ

۱. .عدل کے دو مفہوم عام اور خاص تصور کیے جا سکتے ہے.

- .دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنا.
- .حکیمانہ عمل انجام دینا جن میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے.

۲. عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ: ہر انسان کو اس کی توانائی کے مطابق عمل انجام دینے اور اسی توانائی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اسی عمل اور توانائی کے مطابق جزا یا سزا ہے.

۳. .دلیل عدل الٰہی یہ ہے کہ: ممکن الوجود کے تمام امور اللہ کی قدرت میں ہیں لیکن اللہ ہر وہ فعل جس پر قادر ہے انجام نہیں دیتا بلکہ وہ فعل جس میں خیر اور کمال ہو اسے انجام دیتا ہے

۴. جب اللہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فعل صفات کمالیہ الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے. صفات کمالیہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سرچشمہ بنے لہٰذا انسان کو مختار قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ شر یا خیر کی راہ میں سے جس کو چاہے انتخاب کرے کیونکہ اختیار کمال کی نشانی ہے.

۵. اللہ نے احکام کو وضع کیا تاکہ انسان اس پر عمل کرکے سعادت مند بن جائے اگر اللہ بندوں پر ایسے احکام وضع کرے جو مکلفین کی طاقت سے باہر ہوں تو پھر ان اعمال کے بجالانے پر جزا یا سزا دیا جانا خلاف عدل قرار پاتا.

۶. عدل الٰہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور عادلانہ اعمال کا سبب ہیں .ایسی کوئی صفات اللہ کی ذات میں نہیں پائی جاتیں جن میں ظلم و ستم یا عبث ہونے کا شائبہ تک پایا جاتا ہو.

بسمہ تعالی

المصطفیٰ ورچوئل یونیورسٹی

عقائد اسلامی (۱)

چونتیسواں سبق

عدل الٰہی

بیچلر B.A

تمہید

اصول دین کی ایک اصل عدل الٰہی ہے. عدل الٰہی اشعری اور معتزلی متکلمین کے درمیان بنیادی اختلافی مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ہے. عدل الٰہی تو اصول دین میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کیونکہ عدل الٰہی ایک طرف سے قیامت سے مربوط ہے تو دوسری طرف جزاو سزا سے.

اس کے علاوہ اجتماعی و اخلاقی اور تربیتی مسائل کا دارومدار بھی عدل الٰہی کے انکار یا اقرار پر ہے. ہم اس سبق میں عدل کے مفہوم اور اس کے دلائل بیان کریں گے اور آخر میں اسی حوالے سے بیان کیے گئے اعتراضات کے جوابات بھی دیں گے.

تفصیل

ہم نے سابقہ سبق میں متکلمین کے دو گروہوں (اشعری اور معتزلی) کے کلامی نظریات، ارادہ الٰہی، توحید، جبر و اختیار، قضا و قدر کے سلسلہ میں گفتگو کی کہ جن میں وہ حد اعتدال سے آگے بڑھ گئے اور من گھڑت قسم کے نظریات اپنا لیے.

انہی دو گروہوں کے درمیان بنیادی اختلاف میں سے ایک عدل الٰہی کا مسئلہ ہے، اس نظریہ میں شیعہ متکلمین، معتزلہ کے موافق ہیں جنھیں اشاعرہ کے مقابلے میں عدلیہ کہا جاتا ہے، اور یہ مسئلہ اپنی اہمیت کی وجہ سے علم کلام کے بنیادی و اساسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس مسئلہ کو اصول عقائد کا ایک حصہ اور شیعہ و معتزلہ متکلمین کی پہچان کے عنوان سے جانا گیا ہے.

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اشاعرہ عدل الٰہی کے منکر نہیں ہیں، اور ایسا ہر گز نہیں ہے کہ وہ (**العیاذ باللہ**) خدا کو ظالم سمجھتے ہوں، اس لئے کہ قرآن کی آیات واضح انداز میں عدل الٰہی کے اثبات اور اس سے ہر طرح کے ظلم کی نفی کرتی ہیں، لیکن اصل اختلاف یہ ہے کہ کیا عقل، شرعی بیانات (کتاب و سنت) سے ہٹ کر خدا کے افعال کے لئے قوانین کا ادراک کر سکتی ہے، اور اس طرح کسی عمل کے انجام دینے یا اسے ترک کرنے کا حکم دے سکتی ہے، مثلاً کیا "خدا کے لئے لازم ہے کہ مومنوں کو بہشت اور کافروں کو دوزخ میں لے جائے" کیا عقل اسکا حکم دے سکتی ہے، یا پھر ایسے قضایا کا حل صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے اور عقل کی ایسے مسائل میں دخل اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے؟

لہٰذا اختلاف کا محوری نقطہ (حُسن و قبح عقلی) کا مسئلہ ہے جس سے اشاعرہ نے انکار کیا ہے اور وہ قائل ہیں کہ تکوینی امور میں جو خدا کا فرمان ہے وہی بہتر ہے، اور (تشریعی امور) میں صرف اسی کا حکم اچھا اور بہتر ہے، اور ایسا ہر گز نہیں ہے کہ وہ نیک کام ہے لہٰذا اسے انجام دینے کا حکم دیا جائے یا برا کام ہے لہٰذا اس سے روکا جائے.

لیکن عدلیہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ تکوینی اور تشریعی مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے افعال خدا کو (حُسن و قبح) سے متصل کیا جا سکتا ہے، اور عقل بھی ایک حد تک افعال کے برے یا اچھے ہونے کے اسباب کا پتا لگا سکتی ہے اور وجود مقدس الٰہی کو افعال قبیحہ سے منزہ کر سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل خدا کو (**العیاذ باالله**) نیک امور کا حکم دے یا برے امور سے منع کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل ذات خداوندی سے افعال قبیحہ کے صدور کو محال جانتی ہے نیز ذات الٰہی اور افعال حسنہ یا قبیحہ کے درمیان نسبتوں کا اندازہ لگا سکتی ہے.

یہ بات آشکار ہے کہ ان مباحث کی تفصیلی تحقیق اور اس ضمن میں شبہات کا جواب جس میں اشاعرہ کی طرف سے (حُسن و قبح) عقلی کا انکار کیا گیا ہے اور انھیں جماعت عدلیہ کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے تحت معتزلہ کے بعض نظریات ضعیف ہوں کہ جن کی ہم مناسب موقع پر وضاحت کریں گے، لیکن یہ حُسن و قبح عقلی کا مسئلہ شیعوں کے نزدیک قابل قبول اور کتاب و سنت کی طرف سے تائید کے علاوہ، معصومین علیہم السلام نے اس کے اثبات میں بڑی تاکید کی ہے.

اسی وجہ سے ہم یہاں پر مفہوم عدل کے تحت تھوڑی وضاحت کریں گے، اور چونکہ یہ خدا کی صفاتِ فعلیہ ہیں لہٰذا اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے اس ضمن میں موجودہ شبہات کے سلسلہ میں بحث کریں گے.

مفہوم عدل

عدل کے لغوی معنی برابری اور مساوی کرنے کے ہیں، اور عرف عام میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنے کے معنی میں ہے. جسے دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے پس عدل کی اس طرح تعریف کی جا سکتی ہے "**اِعطَاءُ کُلّ ذِي حَقٍ حَقَّهُ**" صاحب حق کے حق کو عطا کرنا لہٰذا اس تعریف کے تحت ایک ایسے موجود کو فرض کرنا ہوگا جو صاحب حق ہو، تاکہ اس کی رعایت کو عدل اور اس پر تجاوز کو ظلم کا نام دیا جا سکے لیکن کبھی مفہوم عدل کو وسعت دیتے ہوئے اس طرح تعریف کی جاتی ہے، کہ (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا اور کسی بھی فعل کو شائستہ صورت میں انجام دینا) اور پھر اس طرح عدل کی تعریف "**وضع کل شيءٍ في موضعه**" (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا) کی جا سکتی ہے، عدل کی یہ تعریف حکمت کے مساوی اور ایک

عادلانہ حکیمانہ عمل کا مساوی کہلائے گی. لیکن کسی طرح (صاحب حق کا حق) کسی بھی شئی کا اپنا مقام معین ہو، اس سلسلہ میں کافی بحث ہے جس نے فلسفہ اور کلام کے عظیم مباحث کو اپنے سے مخصوص کر لیا ہے جنھیں ہم یہاں پر کسی بھی صورت میں بیان نہیں کر سکتے.

لیکن جس مسئلہ کی طرف توجہ لازمی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام عقلا اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یتیم کے منہ سے لقمہ کو چھیننا یا ناحق کسی کا خون بہانا، ایک قبیح عمل ہے، یا یتیم کے دہن سے چھینا گیا لقمہ اس کے منہ میں لوٹا دینا یا ناحق خون بہانے والے کو سزا دینا ایک عادلانہ اور شائستہ عمل ہے، اور یہ امر خدا کے امر و نہی پر منحصر نہیں ہے یہاں تک کہ ایک ملحد بھی اپنے مقام پر یہی قضاوت کرتا ہے لیکن اس فیصلہ کا راز کیا ہے؟ اور کون سی طاقت حسن و قبح کے تعین کی صلاحیت رکھتی ہے اسی طرح کے اور دوسرے مسائل کے بارے میں فلسفہ کی کتابوں میں بحث کی جاتی رہی ہے.

چونتیسواں سبق

نتیجہ. عدل کے لئے دو مفہوم خاص اور عام فرض کیے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا، اور دوسرے یہ کہ حکیمانہ عمل انجام دینا، کہ جس میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے.

لہٰذا عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے جیسے کہ عادل استاد وہ نہیں ہے جو محنتی اور کاہل شاگردوں کو برابر سے تشویق یا انھیں مساوی حثیت سے سزا دے، یا عادل قاضی وہ نہیں ہے جو مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مورد نزاع مال کو مساوی تقسیم کر دے، بلکہ عادل استاد وہ ہے جو ہر شاگرد کو اس کی شائستگی کے مطابق تشویق یا اس کی کاھلی کے اعتبار سے اسے سزا دے، اور عادل قاضی وہ ہے جو مال کو اس کے مالک کے حوالہ کر دے.

اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ تمام مخلوقات کو ایک جیسا خلق کرے، جیسے کہ پرندوں کی طرح انسان کو بھی بال و پر عطا کرے بلکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ جہان کو اسی صورت میں خلق کرے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ خیر و کمال مل سکے، اور مختلف موجودات کو ان کے انتہائی ہدف کے مطابق خلق کرے اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی استعداد کے مطابق عمل انجام دینے کا حکم دے. ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلاَّ وُسعَھَا''[1] اور پھر اس کی استعداد اور توانائی کے مطابق قضاوت کرے. ''وَقُضِیَ بَینَھُم بِالقِسطِ وَھُم

[1]. بقرہ/۲۸۶

لاَ یُظلَمُون ' '[1] اور اس کے عمل کے عوض میں سزا، یا جزا عطا کرے. '' فَالیَومَ لاَ تُظلَمُ نَفسٌ شَیئاً وَلاَ تُجزَونَ اِلَّا مَاکُنتُم تَعمَلُونَ ''[2].

دلیل عدل الٰہی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ عدل ایک تعریف کے مطابق حکمت الٰہی کا حصہ اور دوسری تعریف کے مطابق عین حکمت الٰہی ہے، لہٰذا اس کے اثبات میں دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے جو حکمت الٰہی کو ثابت کر سکے، جس کے بارے میں گیارہویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، یہاں پر مزید اس کی وضاحت کی جا رہی ہے.

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا بے نہایت قدرت و اختیار کا مالک ہے اور تمام ممکن الوجود امور اسی کی قدرت میں ہیں، اور کسی بھی خارجی طاقت کے سامنے تسلیم اور مغلوب ہوئے بغیر امور کی انجام دہی یا انھیں ترک کرنے پر قادر ہے، لیکن ہر وہ فعل جسے انجام دے سکتا ہے انجام نہیں دیتا بلکہ جس کے لئے ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے.

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ بے حساب و کتاب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ اپنے صفات کمالیہ کے مطابق ارادہ کرتا ہے، اور اگر اس کے صفات کمالیہ کسی فعل کا تقاضا نہ رکھتے ہوں تو وہ کبھی بھی اسے انجام نہیں دیتا، چونکہ ذات خداوند کمالِ محض ہے، لہٰذا اس کا ارادہ بھی مخلوقات کے کمال اور ان کے خیر سے متعلق ہوتا ہے، اور اگر کسی مخلوق کے وجود کا لازمہ، جہان میں نقائص کی پیدائش کا سبب ہو تو اس کے نقائص مقصود بالتبع ہوں گے.

یعنی اس لئے کہ وہ خیر فراواں ناقابل انفکاک (شر) کا لازمہ ہے، لہٰذا اس خیر غالب سے ارادہ الٰہی متعلق ہوگا.

پس الٰہی صفات کمالیہ کا اقتضا یہ ہے کہ جہان اس طرح خلق ہو کہ جو مجموعاً زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سرچشمہ بن سکے لہٰذا یہیں سے خدا کے لئے صفات کمالیہ ثابت ہو جاتے ہیں اسی بنیاد پر ارادۂ الٰہی اسی انسان کی خلقت سے متعلق ہوتا ہے کہ جس میں امکان موجود ہو اور "خیر و برکت کا منشا ہو، اور انسان کے امتیازات میں سے اس کا مختار ہونا اور ارادہ کے اعتبار سے آزاد ہونا ہے، بے شک اختیار و انتخاب کی طاقت سے متصف ہونا کمالات وجودی میں سے شمار کیا جاتا ہے، لیکن انسان کے مختار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نیک امور انجام دے، اور اپنے انتہائی کمال کی جانب قدم بڑھاتا رہے، اور اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ناپسند اور بُرے امور سے اپنے آپ کو بچالے تاکہ شقاوت جاودانی اور خسران عظیم سے محفوظ رہ سکے، البتہ وہ امر جو تنہا ارادہ الٰہی سے متعلق ہوتا ہے وہ صرف تکامل ہے

---

[1]. یونس/۵۴

[2]. یس/۵۴

لیکن چونکہ انسان کے تکاملِ اختیاری کے لازمہ کے ساتھ امکانِ سقوط بھی ہے، جو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ایسا سقوط اختیاری بھی بالتبع ارادہ الٰہی سے متعلق ہوگا.

اور چونکہ صحیح انتخاب خیر و شر کی راہوں کی صحیح شناخت کا محتاج ہے، لہٰذا خدا نے انسان کو انھیں امور کے انجام دینے کا حکم دیا ہے جن میں زیادہ سے زیادہ خیر و مصلحت ہو اسی طرح تباہی و بربادی کے عوامل سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے، تاکہ اس طرح اس کے تکامل کا وسیلہ فراہم ہو جائے اور چونکہ تکالیف اور احکام اس لئے وضع ہوئے ہیں تاکہ انسان ان پر عمل کرتے ہوئے مفید نتائج تک پہنچ سکے کہ جس میں خدا کے لئے نہ کوئی نفع ہے اور نہ ہی نقصان، اس وجہ سے حکم الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ احکام مکلفین کی طاقت کے مطابق ہوں اس لئے کہ وہ احکام جن پر عمل نہیں کیا جا سکتا وہ بے فائدہ اور لغو ہیں.

پس اس طرح عدل کا پہلا مرحلہ (اپنے خاص معنی میں) یعنی مقام تکلیف میں عدالت اس دلیل سے ثابت ہے کہ اگر خدا بندوں کی طاقت سے ماوراء ان پر کوئی حکم نافذ کرے تو وہ چونکہ امکان عمل سے باہر ہے لہٰذا ایک بے فائدہ عمل کہلائے گا.

لیکن بندوں کے درمیان فیصلہ میں عدالت کا مسئلہ اس نکتہ کی طرف توجہ دینے کے ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے تاکہ سزا و جزا کے اعتبار سے انسان مشخص ہو سکے، لہٰذا اگر ایسی صورت میں خدا نے عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو نقص غرض لازم آئیگی.

آخر کار سزا اور جزا دینے کا مقصد مقام عدالت ہدفِ خلقت کے پیش نظر ثابت ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس نے انسان کو اچھے اور برے امور کے نتائج تک رسائی کے لئے خلق کیا ہے اگر انھیں اس ہدف کے خلاف سزا یا جزا دینا چاہے تو وہ کبھی بھی اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکتا.

لہٰذا تمام مظاہر کے درمیان عدل الٰہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور عادلانہ اعمال کا سبب ہیں اور ایسی کوئی صفت بھی اس کی ذات میں نہیں پائی جاتی جس میں ظلم و ستم یا عبث ہونے کا شائبہ پایا جاتا ہو.

پینتیسواں سبق

چند اعتراضات کا جواب

۱. مخلوقات کے درمیان خصوصاً انسانوں میں موجود اختلافات عدل الٰہی سے کس طرح سازگار ہیں؟ اور کیوں خدا نے اپنی تمام مخلوقات کو یکساں خلق نہیں کیا؟

جواب : اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات کے درمیان خلقت کے اعتبار سے موجودہ اختلافات نظام خلقت اور اس پر حاکم قانونِ علت و معلول کا لازمہ ہیں تمام مخلوقات کا اپنی خلقت میں یکساں ہونا ایک خام خیالی ہے اگر اس سلسلہ میں ہم تھوڑا بھی غور کر لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ فرض ترک خلقت کے مساوی ہے اس لئے کہ اگر تمام مخلوقات مرد یا عورت ہوتے تو نسل آگے بڑھ نہیں سکتی تھی اور انسانی نسل کا خاتمہ ہو جاتا، اسی طرح اگر تمام مخلوقات انسان ہوتی تو انھیں اپنی احتیاجات کو بر طرف کرنے کے لئے کوئی چیز باقی رہ نہ جاتی اس کے علاوہ اگر تمام حیوانات یا نباتات ایک ہی جیسے اور ایک ہی رنگ سے سرفراز ہوتے تو ایسے دلکش مناظر کے علاوہ مختلف فوائد کا وجود نہ ہوتا، موجودات کا مختلف اشکال میں پیدا ہونا مادہ کے تغیرات کا نتیجہ ہے، اور خلقت سے پہلے کسی کا کوئی بھی حق خدا کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ اسے کیسے اور کس شکل میں خلق کرے، کہاں قرار دے، کس مقام میں اتارے، تاکہ اس طرح عدل قائم رہے اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے.

۲. اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس جہان میں خلق کرے، تو پھر اسے موت کیوں دیتا ہے اور کیوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ

پہلے تو یہ : اس جہان میں موجودات کی زندگی اور موت قوانین تکوینی اور علت و معلول روابط کی وجہ سے ہے، اور یہی نظام خلقت کا لازمہ بھی ہے

دوسرے یہ کہ : اگر زندہ موجودات نہیں مرتے اور باقی رہ جاتے تو آئندہ مخلوقات کے لئے خلقت کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا اور وہ وجود و حیات کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے.

تیسرے یہ کہ : اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام انسان خلقت کے بعد ہمیشہ زندہ رہیں تو چند ہی سال کے اندر یہ زمین انسانوں کے لئے تنگ ہو جاتی اور لوگ رنج والم اور تنگی کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے لگتے.

چوتھے یہ کہ: انسان کی خلقت کا اصل ہدف کمال تک پہنچنا ہے اور جب تک انسان موت کے ذریعہ اس جہان سے جہانِ ابدی میں منتقل نہیں ہوتا اس وقت تک اپنے انتہائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا.

۳. یہ اس زمین پر بے شمار طبیعی بلاؤں اور رنج والم (جیسے زلزلہ سیلاب وغیرہ) اور اجتماعی مشکلات جیسے جنگ ،جدال) کیونکر عدل الٰہی سے سازگار ہیں؟

سب سے پہلے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے ناگوار حوادث کا وجود مادی تغیرات کا نتیجہ ہے اور جبکہ اس کی حکمت ان کے عیوب پر غالب ہے لہٰذا یہ کسی بھی حال میں مخالف حکمت نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ اجتماعی مشکلات کا اٹھنا انسان کے مختار ہونے کا لازمہ ہے جو حکمت الٰہی کا تقاضا ہے اور زندگی کے مصالح اس کے مفاسد سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ اگر صرف مفاسد ہی مفاسد ہوتے تو اس زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہتا.

دوسرے یہ کہ، ایک طرف بے شمار رنج وزحمت کا ہونا اسرار طبیعت کو کشف کرنے کے لئے انسانوں کی حرکت کا سبب اور مختلف علوم وفنون کے ایجاد کا انگیزہ ہے اور دوسری سختیوں سے نبرد آزمانا، نیز اس سے مقابلہ کرنا انسانی صلاحیتوں کو پر ثمر بنانے کے لئے اور راہ تکامل کو طے کرنے کے لئے ایک زبردست عامل ہے اس کے علاوہ اس جہان میں اگر سختیوں کو تحمل کرنا نیتِ خیر کے ساتھ ہو تو جہانِ ابدی میں عظیم نعمات سے سرفرازی کا سبب ہے.

۴. اس زمین پر ہونے والے محدود گناہوں کی سزا عذاب ابدی کی شکل میں کیونکر عدالت سے سازگار ہے؟

جواب: اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نیک اور بد اعمال کے درمیان، اور اخروی سزا وجزا کے درمیان ایک قسم کا رابطۂ علیت پایا جاتا ہے جسے وحی الٰہی کے ذریعہ لوگوں کو سنا دیا گیا ہے اور جس طرح اس جہان میں بعض حوادث واشرار، طولانی آثار کا سبب بنتے ہیں جیسے کہ انسان کا اپنی یا دوسروں کی آنکھوں کو پھوڑ دینا ایک لحظہ کا عمل ہے لیکن اس کے آثار یعنی نابینائی آخر عمر تک باقی رہتی ہے اس طرح بڑے بڑے گناہ آخرت میں ابدی آثار سے متصف ہیں، لہٰذا اگر کوئی اس جہان میں انھیں ان کی تلافی نہ کرے (جیسے کہ توبہ نہ کرے) تو اس کے برے آثار ابد تک، اس کے دامن پر رہیں گے، جس طرح انسانوں کا آخری عمر تک اندھا رہنا تنہا اور تنہا ایک لحظہ کی شرارات کا نتیجہ ہے، اور عدل الٰہی سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اسی طرح گناہوں کے نتیجہ میں عذاب ابدی میں گرفتار ہونا، عدل الٰہی سے منافات نہیں رکھتا، اس لئے کہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، وہ ان گناہوں کا نتیجہ ہے، جسے اس نے جانتے ہوئے انجام دیا ہے.

خلاصہ

۱. .عدل کے دو مفہوم عام اور خاص تصور کیے جا سکتے ہے.

- .دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنا.
- .حکیمانہ عمل انجام دینا جن میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے.

۲. عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ: ہر انسان کو اس کی توانائی کے مطابق عمل انجام دینے اور اسی توانائی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اسی عمل اور توانائی کے مطابق جزا یا سزا ہے.

۳. .دلیل عدل الٰہی یہ ہے کہ: ممکن الوجود کے تمام امور اللہ کی قدرت میں ہیں لیکن اللہ ہر وہ فعل جس پر قادر ہے انجام نہیں دیتا بلکہ وہ فعل جس میں خیر اور کمال ہو اسے انجام دیتا ہے

۴. جب اللہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فعل صفات کمالیہ الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے. صفات کمالیہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سرچشمہ بنے لہٰذا انسان کو مختار قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ شر یا خیر کی راہ میں سے جس کو چاہے انتخاب کرے کیونکہ اختیار کمال کی نشانی ہے.

۵. اللہ نے احکام کو وضع کیا تاکہ انسان اس پر عمل کرکے سعادت مند بن جائے اگر اللہ بندوں پر ایسے احکام وضع کرے جو مکلفین کی طاقت سے باہر ہوں تو پھر ان اعمال کے بجالانے پر جزا یا سزا دیا جانا خلاف عدل قرار پاتا.

۶. عدل الٰہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور عادلانہ اعمال کا سبب ہیں .ایسی کوئی صفات اللہ کی ذات میں نہیں پائی جاتیں جن میں ظلم و ستم یا عبث ہونے کا شائبہ تک پایا جاتا ہو.